آستین کے پالے

محمد فیصل - محمد سجاد بھٹی

محمد فیصل
محمد سجاد بھٹی

آستین کے سانپ

ملک صفدر حیات

ایک غیر روایتی زمین دار کے ساتھ پیش آنے والے ذاتی واقعات

ایک ناتواں پودے کو باد سموم سے بچا کر اپنے چمن کی زینت بنانے والے مالی کا احوال۔ پودے کا تناور شجر بننا تھا کہ چمن میں ہر طرف کانٹے ہی کانٹے بکھر گئے۔ اپنے حق میں آپ کانٹے بونے والوں کو کسی سے شکایت کا کیا حق! اس مالی نے بھی کسی سے شکایت نہ کی... اور نہ ہی اُسے اس کی مہلت ملی۔

لاہور سے میرے کچھ مہمان آئے ہوئے تھے اور ان کی خاطر ہم نے کلری جھیل کی سیر کا پروگرام بنایا تھا۔ پکنک پر ہم نے سارا دن خوب لطف اٹھایا اور پھر پانچ بجے کے قریب واپسی کے لیے کراچی کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم تھوڑی دیر کے لیے ٹھٹھہ شہر میں رکے۔ پروگرام یہ تھا کہ ٹھٹھہ کی تاریخی شاہ جہانی مسجد بھی دیکھ لی جائے۔ میں مسجد کے سامنے کوسٹر سے اترا ہی تھا کہ قریب کھڑی ہوئی سفید رنگ کی نسان سنی کار سے ایک آدمی اتر کر میری طرف بڑھا۔ اس کے پیچھے سادہ لباس والے دو گن مین بھی تھے۔ وہ شخص قریب آکر چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر بے اختیار ہو کر مجھ سے لپٹ گیا۔ میں نے بھی اسے پہچان لیا۔ وہ ٹھٹھہ کا ڈی ایس پی علی محمد جونیجو تھا۔

علی محمد جونیجو سے میری ملاقات کئی مہینے پہلے کراچی میں ایک اور دوست کے توسط سے ہوئی تھی۔ اس روز خاصی دیر تک ہماری گپ شپ ہوئی تھی اور آج یہ ہماری دوسری ملاقات تھی۔

میں وہیں کھڑا علی محمد جونیجو سے باتیں کرتا رہا جب کہ میرے اہلِ خانہ اور مہمان مسجد میں جا چکے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ لوگ مسجد سے باہر آئے تو علی محمد جونیجو ہم سب کو اپنے بنگلے پر لے گیا۔ اس نے گھر میں پہلے ہی اطلاع بھجوا دی تھی کہ مہمان آرہے ہیں۔ گھر میں نہ صرف چائے کا بندوبست تھا بلکہ رات کے کھانے کی بھی تیاری شروع کر دی گئی تھی۔

علی محمد جونیجو نے ہمیں زبردستی رات کے لیے اپنے ہاں روک لیا تھا۔ میں اور جونیجو رات دیر تک لان میں کرسیوں پر بیٹھے باتیں کرتے رہے اور پھر تین بجے کے لگ بھگ میں سونے کے لیے بستر پر لیٹا تھا۔

حسبِ معمول میری آنکھ صبح ساڑھے چار بجے کھل گئی۔ اس وقت فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ پانچ بجے نماز ہوتی تھی۔ علی محمد جونیجو بھی جاگ گیا تھا۔ ہم دونوں تیار ہو کر شاہ جہانی مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے بنگلے سے نکل آئے۔ مسجد بنگلے سے زیادہ دور نہیں تھی۔

فجر کی نماز پڑھنے کے بعد علی محمد جونیجو نے مسجد ہی میں دو تین آدمیوں سے میرا تعارف کرایا۔ ان میں ایک سرکاری افسر تھا اور باقی شہر کے معززین میں شمار ہوتے تھے۔ ہم تقریباً بیس منٹ تک وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور پھر اکٹھے ہی باہر آنے کے لیے مسجد کے مرکزی دروازے کی طرف چلنے لگے۔

مسجد کے داخلی گنبد کے نیچے ایک خوب صورت محرابی دروازے سے گزرتے ہوئے میں ٹھٹک کر رک گیا۔ میری نظریں اس آدمی پر لگی ہوئی تھیں جو مسجد کے صحن میں بچھی ہوئی صفیں اٹھا اٹھا کر ایک طرف رکھ رہا تھا۔ اس شخص نے نیلے رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ سر پر سفید پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ لمبی سفید داڑھی اور اس کی عمر پچپن اور ساٹھ کے درمیان رہی ہوگی۔ آنکھوں پر دبیز شیشوں والی عینک لگی ہوئی تھی۔ عینک کی ایک ڈنڈی غائب تھی۔ اس کی جگہ فریم میں دھاگا بندھا ہوا تھا جو کان کے گرد لپٹا ہوا تھا۔

اس شخص نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ وہ چند لمحے عینک کے پیچھے عجیب سی نگاہوں سے مجھے گھورتا رہا پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا میرے قریب آگیا۔

"میں نے آپ کو کتے نہ کتے دیکھا ہے۔" وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا "پر اے تو بڑی پرانی گل اے۔ کئی ورے بیت گئے نے......"

"ہاں غلام حسین! میں نے بھی تمہیں پہچان لیا ہے۔" میں نے جواب دیا "بات واقعی بہت پرانی ہو گئی ہے۔ کئی سال بیت گئے ہیں لیکن یہ دنیا بہت چھوٹی ہے۔ آدمی زندہ ہو تو کہیں نہ کہیں ملاقات ہو ہی جاتی ہے۔"

"آہو جی!" غلام حسین نے سر ہلایا "اے دنیا واقعی بڑی چھوٹی اے۔ آپ یہاں کب آئے ملک جی؟"

"میں اپنی ملازمت سے ریٹائر ہو چکا ہوں۔ یہ میرے دوست ہیں یہاں کے ڈی ایس پی۔ انہی کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں اور آج واپس چلا جاؤں گا کراچی۔ تم میرے ساتھ ان کے بنگلے پر چلو، تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"آپ چلیں جی۔ میں آتا ہوں کم مکا کے۔" غلام حسین نے جواب دیا "آپ مل گئے ہیں تو میں نے بھی آپ سے بہت ساری گلاں کرنیاں ہیں۔ دل کا وہ بوجھ ہولا کرنا ہے جو پینتی وریوں سے اٹھائے پھر رہا ہوں۔ میں نے صاب کی کوٹھی دیکھی ہوئی ہے۔ آپ

چلیں، میں آتا ہوں۔"

میں علی محمد جونیجو کے ساتھ محرابی دروازے سے نکل کر باہر آگیا اور تقریباً آٹھ منٹ میں ہم بنگلے پر پہنچ گئے۔ سب لوگ جاگ چکے تھے۔ علی محمد جونیجو نے ایک نوکر سے کہہ کر وسیع و عریض صحن میں آم کے درخت کے نیچے کرسیاں ڈلوا لیں اور ہم وہاں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

"یہ آدمی کون ہے ملک صاحب! آپ اسے کیسے اور کب سے جانتے ہیں؟" علی محمد جونیجو نے پوچھا۔ اس کا اشارہ غلام حسین کی طرف تھا۔

"یہ لاہور کے ایک نواحی گاؤں کا رہنے والا ہے۔" میں نے جواب دیا "میں نے اسے تقریباً پینتیس سال پہلے دیکھا تھا۔ یہ گاؤں کا موچی تھا۔ جوتے گانٹھا کرتا تھا۔ میں ان دنوں اسی علاقے میں قتل کے ایک کیس کی تفتیش کر رہا تھا۔ گاما موچی (غلام حسین) اس کیس کا ایک اہم گواہ تھا لیکن پھر یکایک یہ لاپتا ہو گیا۔ ان دنوں اس کی عمر بیس بائیس سال رہی ہوگی۔ بڑا خوب رو جوان تھا۔ اس کے ماں باپ اور گاؤں والے سب ہی اس کی گم شدگی پر پریشان تھے۔ اسے ہر جگہ تلاش کیا جاتا رہا لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ کئی سال بعد مجھے ایک بار پھر اسی گاؤں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے گاؤں کے لوگوں سے خاص طور سے اس کے بارے میں دریافت کیا تھا لیکن کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اسے بھی قتل کر کے کہیں پھینک دیا گیا ہے۔ باپ اس کے غم میں مر گیا۔ ماں رو رو کر اندھی ہو گئی اور آج تقریباً پینتیس سال بعد یہ شخص مجھے نظر آیا ہے۔"

چائے پیتے ہوئے بھی ہم گامے موچی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد گاما موچی بنگلے کے گیٹ پر نظر آیا۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے سنتری نے اسے روک لیا تھا۔ علی محمد جونیجو نے اونچی آواز میں سنتری سے سندھی زبان میں کچھ کہا جس پر سنتری گامے موچی کو لے کر ہماری طرف آگیا۔ قریب پہنچ کر گامے موچی نے ہمیں سلام کیا اور گھاس پر بیٹھ گیا۔ میں نے اور جونیجو نے اسے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا لیکن وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "میں تہاڈے قدماں میں ہی ٹھیک ہاں جی۔"

علی محمد جونیجو نے ملازم کو آواز دے کر اس کے لیے چائے منگوالی۔ وہ خاموشی سے چائے پی رہا تھا اور میں بڑی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

پینتیس سال بعد گامے موچی کو دیکھ کر میرے ذہن میں بہت سی یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔ آج میں آپ کو ایک ایسی ہی کہانی سنانے جا رہا ہوں جس سے گامے موچی کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ آخر میں آپ ہی کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ میں نے پینتیس سال پہلے جو فیصلہ

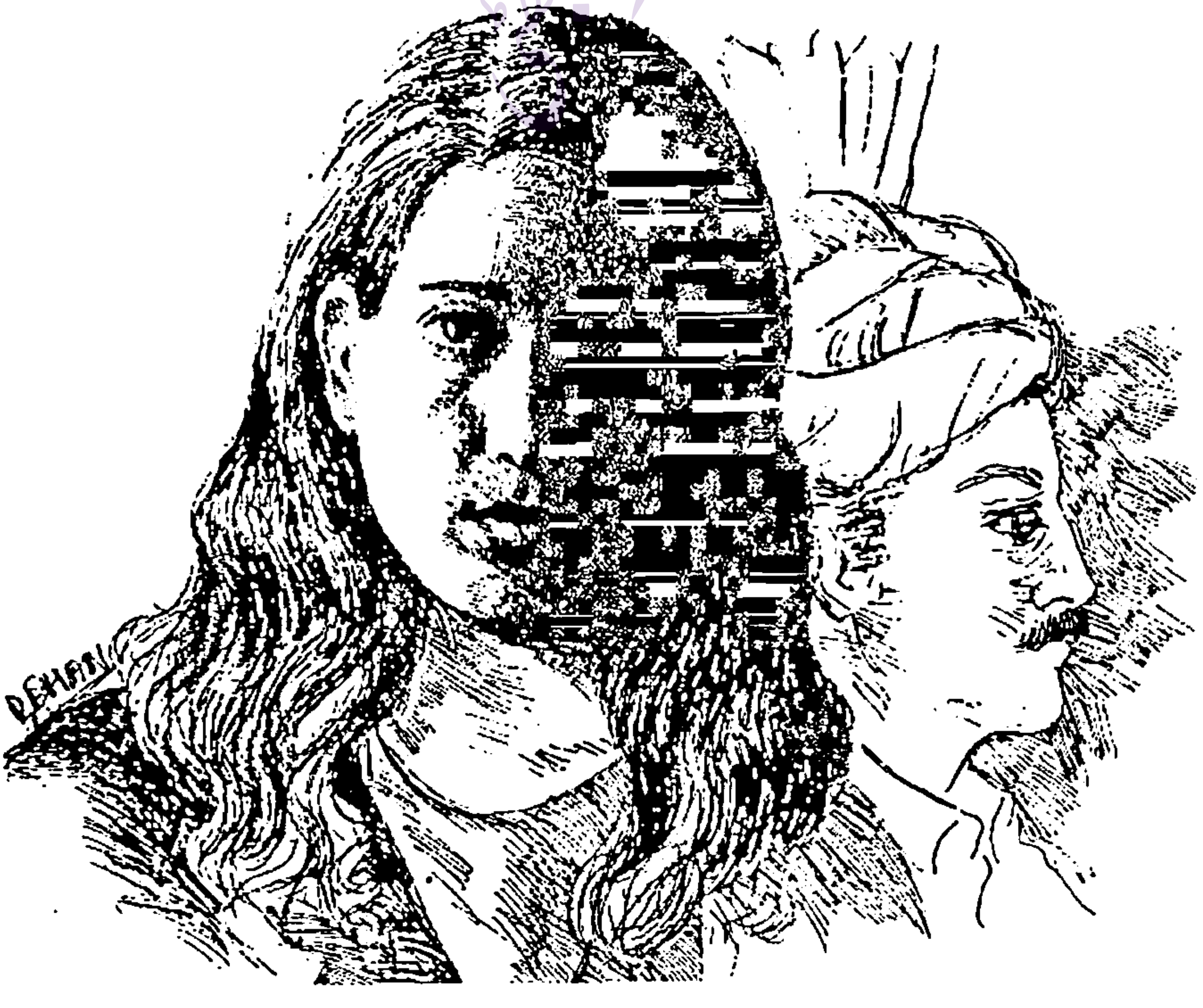

کیا تھا وہ غلط تھا یا درست!

* * *

میں ان دنوں لاہور کے نواحی علاقے داروغہ والا میں تعینات تھا۔ اس زمانے میں میلوں دور دور تک کے گاؤں دیہات اس تھانے کی حدود میں آتے تھے۔ بعد میں مزید تھانے قائم ہوئے تو علاقے بٹ گئے تھے۔ بہرحال، دور دراز کے علاقوں تک آمدورفت کے لیے ہمیں سرکار کی طرف سے گھوڑے ملے ہوئے تھے جن کی دیکھ بھال اور ٹہل سیوا کے لیے ہر تھانے میں ایک سائیس موجود تھا۔ میرے پاس ایک سفید گھوڑی تھی جس کے ماتھے پر کالے بال تھے۔ بڑی خوب صورت اور شہ زور گھوڑی تھی۔ اشارے پر چلتی تھی۔ کئی زمیں دار ایسے تھے جو میری گھوڑی حاصل کرنا چاہتے تھے اور مجھے منہ مانگی قیمت دینے کو تیار تھے لیکن میں کسی قیمت پر بھی یہ گھوڑی بیچنے کو تیار نہیں تھا۔

ان زمیں داروں کے شوق بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں اور ان کا مقصد صرف اور صرف اپنی نمود و نمائش ہوتا ہے۔ کتے پالنے اور کتے لڑانے کا شوق بھی اپنی جگہ دلچسپ تھا۔ ایک زمیں دار کے پاس میں نے تقریباً ڈھائی سو کتے دیکھے تھے۔ تقریباً ایک ایکڑ زمین کا رقبہ اس نے ان کتوں کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ دس بارہ آدمی ان کتوں کی دیکھ بھال کے لیے رکھے گئے تھے۔ زمیں دار کے مزارع تو دال روٹی اور چٹنی پر ہی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن ان کتوں کے لیے ہر روز کئی من گوشت شہر سے آتا تھا۔

اس زمانے میں اس علاقے میں کتوں کی لڑائی بھی بڑی مشہور تھی۔ شادی پور سے سرحدی گاؤں بھینی کی طرف جانے والے راستے پر شادی پور سے تین چار میل آگے جھگیاں نام کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ اس بستی سے آگے چار پانچ ایکڑ پر مشتمل ایک چٹیل میدان تھا۔ یہاں خشت سازی کا ایک بھٹا ہوا کرتا تھا جو عرصہ پہلے ختم ہو چکا تھا۔ اس بھٹے کی وجہ سے آس پاس کی زمین بنجر ہو گئی تھی۔ اس بنجر اور چٹیل میدان میں ہر چاند کی چودھویں شب کو کتوں کی لڑائی ہوا کرتی تھی۔ مناواں، شریف پورہ، محمود بوٹی، لکھوڈیر، بھینی اور دور دراز کے علاقوں کے زمیں داروں کے کتے اس لڑائی میں حصہ لیتے تھے۔ ہار جیت پر ہزاروں کی شرطیں لگتی تھیں اور محض کتوں کی ہار جیت پر زمیں داروں میں نئی دشمنیاں جنم لیتی تھیں اور اس طرح زمیں داروں کو پیسہ خرچ کرنے اور وقت گزارنے کا ایک مشغلہ مل جاتا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس روز میں اپنے دو کانسٹیبلوں کے ساتھ سلامت پورہ اور اردگرد کے دو تین دیہاتوں کا گشت مکمل کرنے کے بعد تھانے واپس آیا تو گھوڑی سے اترتے ہی ایک کانسٹیبل نے پیغام دیا کہ ایس ایچ او صاحب میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں اس وقت بہت تھکا ہوا تھا اور کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا لیکن حکم حاکم مرگ مفاجات کے مصداق مجھے ایس ایچ او کے کمرے کا رخ کرنا ہی پڑا۔ یہاں میں آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ میں اس زمانے میں سب انسپکٹر ہوا کرتا تھا اور اپنے کسی سینئر آفیسر کے کسی حکم کو ٹال نہیں سکتا تھا۔ یوں بھی ہمارے تھانے کا ایس ایچ او چند ہفتوں بعد ریٹائر ہونے والا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ہم میں سے کسی کی طرف سے دل میں میل لے کر جائے۔

میں نے گھوڑی سائیس کے حوالے کر دی اور تھانے کے احاطے میں اس طرف چلا گیا جہاں ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا۔ دونوں کانسٹیبل بھی میرے ساتھ تھے۔ کچے راستوں پر سفر کرتے ہوئے ان کے لباس، چہرے اور بال دھول میں اٹے ہوئے تھے اور یقیناً یہی حالت میری بھی ہو رہی تھی۔ ایک کانسٹیبل ہینڈ پمپ چلانے لگا۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا اور پھر رومال سے چہرہ پونچھتا ہوا ایس ایچ او کے دفتر کی طرف چل پڑا۔ برآمدے میں دو دیہاتیوں کی چھترول ہو رہی تھی۔

"یہ کون ہیں۔ انہیں کہاں سے پکڑ کر لائے ہو؟" میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے پوچھا۔

"بکری چور ہیں جی!" ہیڈ کانسٹیبل نے جواب دیا "ساتھ والے پنڈ کی ایک بیوہ مائی کی بکریاں چرا کر لے جا رہے تھے۔ شرم نہیں آئی ان کو۔ کسی چوہدری کے گھر میں سیندھ لگاتے تو پتا چلتا ان کو۔ وہ تھانے لانے سے پہلے ہی مار مار کر جان نکال دیتا ان کی۔"

"مال برآمد ہوا یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"مال تو پورا برآمد ہو گیا ہے جی۔ پر انہوں نے پانچ بکریوں کا جو دودھ بیچا ہے اس کے پیسے کھا گئے ہیں یہ شہدے۔" ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

"وصول کرو ان سے دودھ کے پیسے بھی۔" میں یہ کہتے ہوئے ایس ایچ او کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

چق اٹھا کر اندر داخل ہوتے ہی میں نے سامنے بیٹھے ہوئے ایس ایچ او کو سیلوٹ کیا اور کمرے میں بیٹھے ہوئے دوسرے دو آدمیوں کو دیکھنے لگا۔ وہ دونوں دیہاتی تھے اور صاف ستھرے لباس میں تھے۔ ایک ننگے سر تھا اور دوسرے نے سر پر نیلے رنگ کی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ آنکھوں پر عینک تھی۔ اس کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ دوسرا آدمی بھی تقریباً اسی عمر کا تھا۔

"آؤ ملک صفدر حیات۔ بیٹھو۔" ایس ایچ او انسپکٹر مشتاق نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"کوئی خاص معاملہ ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے انسپکٹر مشتاق کی طرف دیکھا پھر ان دونوں آدمیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہاں بھئی ملک۔ معاملہ تو خاص ہی ہے اسی لیے تمہیں بلایا ہے۔" انسپکٹر مشتاق نے کہا "پہلے ان سے مل لو۔ یہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر کرم دین صاحب ہیں۔" انسپکٹر نے نیلی پگڑی والے کی طرف اشارہ کیا "اور یہ سلامت علی صاحب ہیں۔ زمیں دار مرید احمد کے منشی۔" اس نے دوسرے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ کا مطلب ہے سید پور کے زمیں دار چوہدری مرید احمد؟" میں نے کہا۔

"ہاں ٹھیک سمجھے۔ میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔" انسپکٹر مشتاق نے کہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "یہ دونوں اطلاع لے کر آئے ہیں کہ گزشتہ رات یا آج صبح سویرے کسی نے چوہدری مرید احمد کو قتل کر دیا ہے۔" وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا "مجھے معلوم ہے، تم بہت تھکے ہوئے ہو لیکن چوہدری مرید احمد اس علاقے کا بہت بڑا زمیں دار تھا۔ کسی جونیئر آفیسر کو بھیجنا مناسب نہیں۔ ویسے بھی تم ایسے معاملات میں خاصا تجربہ رکھتے ہو اس لیے میں نے اس کیس کے لیے تمہارا انتخاب کیا ہے۔ ابتدائی طور پر ان سے کچھ پوچھنا چاہو تو پوچھ لو پھر ان کے ساتھ چلے جاؤ۔"

"بہتر ہے۔" میں یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا "آپ دونوں میرے ساتھ آیئے۔"

میں ان دونوں کو لے کر اپنے کمرے میں آگیا اور ان سے ابتدائی نوعیت کے سوالات پوچھنے لگا۔ انہوں نے جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ تھا کہ اس روز گاؤں کے مڈل اسکول میں کھیلوں کے مقابلے ہونے والے تھے جس کی تیاریاں کئی روز پہلے سے کی جا رہی تھیں۔ گاؤں کے باہر میدان میں ان مقابلوں کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ اسکول کے تمام لڑکے اور گاؤں کے تقریباً سب ہی لوگ وہاں جمع تھے۔ مقابلے ٹھیک آٹھ بجے ہونے تھے اور ان کا افتتاح چوہدری مرید احمد کو کرنا تھا۔ میدان کے ایک طرف بہت بڑا شامیانہ لگا ہوا تھا جس کے نیچے بچھی ہوئی کرسیوں پر گاؤں کے بزرگ اور دیگر معززین بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک میز پر بہت سی ٹرافیاں بھی سجی ہوئی تھیں۔

اس اسکول میں کھیلوں اور تعلیمی سرگرمیوں پر مشتمل مقابلے سال میں دو مرتبہ ہوا کرتے تھے اور ان کے تمام تر اخراجات چوہدری مرید احمد ادا کیا کرتا تھا۔ وہ ذہین طالب علموں کو انعامات کے علاوہ تعلیم جاری رکھنے کے لیے وظائف بھی دیتا رہتا تھا۔ زمیں دار ...اور جاگیردار عام طور پر اپنے علاقے میں تعلیم کے پھیلاؤ کو پسند نہیں کرتے کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر گاؤں کے لوگ پڑھ لکھ کر بابو بن گئے تو ان کے کھیتوں میں ہل کون چلائے گا، زمین کا سینہ چیر کر اناج کون پیدا کرے گا۔ اس لیے وہ ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ ان کے علاقے میں کوئی پرائمری اسکول بھی قائم نہ ہونے پائے۔ اگر حکومت کسی گاؤں میں کوئی اسکول بنا بھی دے تو یہ زمیں دار کوشش کرتے ہیں کہ گاؤں کا کوئی بچہ اس اسکول میں داخل نہ ہونے پائے۔ وہاں شہر سے آنے والے ماسٹروں کو بھی ڈرا دھمکا کر واپس بھیج دیا جاتا ہے اور عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ایسے علاقوں میں قائم ہونے والے اسکولوں کی عمارتیں زمیں داروں کے مویشی خانوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں لیکن چوہدری مرید احمد ان روایتی زمیں داروں سے بہت مختلف تھا۔ وہ پڑھا لکھا آدمی تھا اور اپنے علاقے میں علم کے چراغ روشن کر کے جہالت کے اندھیروں کو مٹانا چاہتا تھا۔ اس نے محکمۂ تعلیم سے اپنے گاؤں میں مڈل اسکول کی منظوری لی تھی اور اسکول کی عمارت بھی خود بنوا کر دی تھی۔ شہر سے آنے والے ماسٹروں کو رہائش کے لیے کئی کمروں پر مشتمل نہ صرف اپنا مکان دے دیا تھا بلکہ انہیں اور بھی بہت سی سہولتیں دی تھیں۔

چوہدری مرید احمد اسکول کی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا جس سے طلبا کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ اس روز بھی اسکول کے ششماہی کھیل شروع ہونے والے تھے۔ انتظار صرف چوہدری مرید احمد کا تھا۔

آٹھ بج چکے تھے لیکن چوہدری مرید احمد ابھی تک اپنی حویلی سے نہیں آیا تھا جس سے لوگوں میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔ یوں بھی دھوپ تیز ہو رہی تھی اور کھیل اب شروع ہو جانے چاہیے تھے۔ ہیڈ ماسٹر کرم دین اور چوہدری کا منشی سلامت علی ایک طرف کھڑے کھسر پھسر کر رہے تھے۔

"منشی جی!" ہیڈ ماسٹر کرم دین کہہ رہا تھا "دھوپ تیز ہو رہی ہے، جا کے پتا تو کرو کہ چوہدری صاحب ابھی کیوں نہیں آئے۔"

"میں دو پھیرے لگا چکا ہوں۔ پر وہ پھاتاں ہے نا۔ وہ نوکرانی جو حویلی کی پردھان بنی ہوئی ہے، مجھے چوہدری کے کمرے کی طرف جانے ہی نہیں دیتی۔" منشی سلامت علی نے جواب دیا۔

"پھاتاں کیا کہتی ہے؟" ماسٹر کرم دین نے پوچھا۔

"کہتی ہے چوہدری صاحب سو رہے ہیں۔ رات کو ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ جوشاندہ پی کر سوئے تھے اور کہا تھا کہ صبح انہیں جگایا نہ جائے۔" منشی نے کہا۔

"پر اب تو بڑی دیر ہو گئی ہے۔" ماسٹر کرم دین نے کہا "تم چوہدرانی سے کہو تاکہ وہ چوہدری صاحب کو جگا دے۔"

"تمہیں پتا نہیں ماسٹر کرم دین! چوہدرانی کل دوپہر کو اپنے میکے چلی گئی تھی اور اس کے بعد گھر کا سارا انتظام پھاتاں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔" منشی سلامت علی نے کہا۔

"ان کا پتر شبیر احمد کہاں ہے؟" ماسٹر کرم دین نے پوچھا۔

"وہ بھی پرسوں سے جھگیاں گیا ہوا ہے۔ پنڈ والوں کا آپس میں کوئی جھگڑا ہو گیا تھا وہ فیصلہ کرانے گیا تھا۔ ابھی تک پلٹ کر ہی نہیں آیا۔ میں تو کہتا ہوں تم خود حویلی چلے جاؤ۔ شاید پھاتاں تمہارے کہنے پر چوہدری کو جگا دے۔" منشی نے کہا۔

"چلو۔۔۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" ماسٹر کرم دین نے کہا اور وہ دونوں حویلی کی طرف چل پڑے۔

وہ حویلی میں آگئے۔ وسیع و عریض صحن کے ایک کونے میں ایک مریل سا آدمی مویشیوں کا گوبر صاف کر رہا تھا اور پھاتاں ڈنگروں کو پٹھے ڈال رہی تھی۔ وہ ایک بھاری بھر کم ادھیڑ عمر عورت تھی۔ وہ ان دونوں کو دیکھ کر ادھر آگئی۔

"پھاتاں بی بی۔" ماسٹر کرم دین نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔ "اسکول کے بچے اور پنڈ کے سارے لوگ میدان میں جمع ہیں۔ بس چوہدری صاحب کا انتظار ہے۔ اب تو بہت دن چڑھ آیا ہے۔ چوہدری صاحب اتنی دیر تک تو کبھی نہیں سوئے۔"

"مینوں نہیں پتا ماسٹر جی! آپے جا کے جگالوان کو۔" پھاتاں نے جواب دیا۔

"اچھا تو ہم خود ہی جگا لیتے ہیں۔" ماسٹر کرم دین نے کہا۔

وہ دونوں برآمدے میں سے ہوتے ہوئے راہداری میں آگئے۔ یہ حویلی جدید طرز پر تعمیر کی گئی تھی۔ اس میں کئی کمرے تھے۔ وہ ایک کمرے کے دروازے پر رک گئے۔ ماسٹر کرم دین نے ہولے سے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ دوسری دستک پر بھی خاموشی رہی تو منشی سلامت علی نے دو تین آوازیں بھی دیں مگر اندر مسلسل خاموشی رہی۔ انہوں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر اندر سے کنڈا لگا ہوا تھا۔ انہوں نے زور زور سے دروازہ دھڑدھڑایا مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اتنے میں پھاتاں بھی وہاں آگئی۔

"کی گل اے بس پھاتاں؟" منشی سلامت علی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "چوہدری صاحب دروازہ کیوں نہیں کھول رہے؟"

"مینوں کی پتا جی! ذرا زور سے کھڑکاؤ۔" پھاتاں نے جواب دیا۔

منشی پہلے سے بھی زیادہ زور سے دروازہ دھڑدھڑانے لگا۔ حویلی کے تین چار نوکر بھی وہاں جمع ہو گئے۔ دروازہ نہ کھلنے کی وجہ سے ہر شخص پریشان نظر آرہا تھا۔

"منشی سلامت علی۔" ماسٹر کرم دین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اللہ خیر کرے۔ مجھے تو کوئی گڑبڑ لگ رہی ہے۔ تم ایک بندے کو لے کر پچھلی طرف جاؤ اور کھڑکی سے آواز دو۔"

منشی سلامت علی ایک آدمی کو لے کر راہداری کے پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ کمرے کے پچھلی طرف دو کھڑکیاں تھیں۔ ایک کھڑکی بند تھی جب کہ دوسری کھڑکی کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔

"اوئے کرمو۔" منشی سلامت علی نے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا "باری پر چڑھ کر دیکھ۔ چوہدری صاحب سوئے ہوئے ہیں یا اس باری سے نکل کر کہیں چلے گئے ہیں۔"

"انہوں نے نکل کے کتھے جانا ہے جی۔ اندر سُتے ہوں گے۔" کرمو یہ کہتے ہوئے کھڑکی پر چڑھ کر اندر کود گیا لیکن اسے واپس آنے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ خوف تھا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس کے ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔

"اوئے کیا ہوا کرمو! کچھ بولتا کیوں نہیں؟" منشی سلامت علی نے اسے گھورا۔

"منشی جی ــــ لاش ــــ خون ــــ" کرمو ہکلا کر رہ گیا۔ خوف سے اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔

"کیا بک رہا ہے۔" منشی سلامت علی چیخا اور خود کھڑکی پر چڑھ کر اندر کود گیا۔

کمرے میں دائیں دیوار کے قریب مسہری تھی۔ چوہدری مرید احمد کی لاش مسہری پر اس طرح پڑی تھی کہ اس کا سر نیچے لٹکا ہوا تھا۔ بستر خون سے تر تھا۔ دیوار اور فرش پر بھی خون کے چھینٹے تھے۔ لاش کی ایک آنکھ بند تھی اور ایک کھلی ہوئی تھی۔ جسم پر زخموں کے کئی نشان تھے۔

منشی سلامت علی یہ خوف ناک منظر دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا۔ اس نے چیختے ہوئے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ ماسٹر کرم دین اور دو اور آدمی کمرے میں گھس آئے لیکن اندر کا منظر دیکھتے ہی ٹھٹک کر رک گئے۔

حویلی میں کہرام مچ گیا۔ چوہدری مرید احمد کے قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ میدان میں موجود اسکول کے تمام بچے اور گاؤں کے دوسرے لوگ حویلی میں جمع ہو گئے۔ ماسٹر کرم دین اور منشی سلامت علی نے عقل مندی یہ کی کہ انہوں نے کسی کو کمرے میں داخل نہیں ہونے دیا۔ بعد میں یہی دونوں حضرات قتل کی اطلاع لے کر تھانے آئے تھے۔

یہ تھیں ابتدائی معلومات جو میں ماسٹر کرم دین اور منشی سلامت علی سے معلوم کر سکا تھا لیکن وجۂ قتل معلوم نہیں ہو سکی تھی۔

"ٹھیک ہے!" میں نے حالات سننے کے بعد باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ لوگ چلیں۔ میں بھی پیچھے ہی پہنچ رہا ہوں۔"

وہ لوگ بیل گاڑی پر آئے تھے۔ میں نے دو کانسٹیبل ان کے ساتھ کر دیے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے سائیس سے گھوڑی تیار کرنے کو کہا اور اے ایس آئی حامد علی کو بھی تیار ہونے کا حکم دے دیا۔ اس طرح تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم دونوں بھی تھانے سے نکل کر سید پور کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں تو اپنی سفید گھوڑی پر تھا اور اے ایس آئی حامد علی بھورے رنگ کے گھوڑے پر تھا۔ اگر ہم سڑک کی طرف جاتے تو راستہ بہت لمبا ہو جاتا اس لیے ہم نے کھیتوں میں پگڈنڈیوں کا راستہ اختیار کیا تھا۔ سید پور وہاں سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر تھا اور ہم تقریباً آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچے تھے۔

اس وقت گیارہ بجنے والے تھے۔ موسم اگرچہ سردیوں کا تھا لیکن دھوپ خاصی تیز تھی۔ حویلی کے سامنے گلی میں اور حویلی کے اندر بہت سے لوگ جمع تھے۔ آس پاس کے دیہاتوں کے بعض دوسرے چوہدری بھی مرید احمد کے قتل کی خبر سن کر وہاں آگئے تھے۔ میرے بھیجے ہوئے دونوں کانسٹیبل بھی وہاں موجود تھے۔

"لاش کہاں ہے؟" میں نے کانسٹیبل شریف سے پوچھا۔

"ادھر جی! اس کمرے میں۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ میرے ساتھ ماسٹر کرم دین، منشی سلامت علی اور گاؤں کے دو اور بوڑھے بھی تھے لیکن میں نے انہیں دروازے کے قریب ہی روک دیا تھا۔

"کمرے میں کوئی داخل تو نہیں ہوا یا کسی چیز کو چھیڑا تو نہیں گیا؟" میں نے پوچھا۔

”نہیں جی!“ منشی سلامت علی نے جواب دیا ”پہلے کرمو اور پھر میں اس باری سے اندر آئے تھے۔ کرمو تو چوہدری کی لاش دیکھ کر فوراً ہی باری سے باہر نکل گیا تھا اور میں نے اندر آکر یہ دروازہ کھولا تھا۔ کسی شے کو نہیں چھیڑا جی۔“

میں نے کھڑکیاں کھلوا کر پردے ہٹوا دیے جس سے کمرے میں روشنی ہو گئی۔ بڑا ہی دل سوز منظر تھا۔ اس کے جسم پر کئی زخم تھے جن سے بہنے والا خون جم گیا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کسی تیز دھار آلے سے پے در پے وار کیے گئے تھے۔ جسم پر زخموں کے کچھ پرانے نشان بھی تھے۔ مسہری کی پائنتی کی طرف فرش پر ایک بیساکھی بھی پڑی تھی جس پر خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔

یہاں میں آپ کو یہ بتا تا چلوں کہ چوہدری مرید احمد ایک ٹانگ سے لنگڑا تھا۔ تقسیم سے پہلے اس گاؤں میں ہندو اور سکھ بھی رہا کرتے تھے اور جب فسادات شروع ہوئے تو اس گاؤں کے رہنے والے ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کے گھروں پر حملے کر دیے تھے۔ مسلمان محبتیں بانٹتے رہے تھے اور ہندوؤں اور سکھوں نے چوری چھپے اسلحہ جمع کر کے اس وقت کے لیے تیاریاں مکمل کر رکھی تھیں۔

ہندوؤں اور سکھوں کے ایک ملے جلے گروہ نے رات کے آخری پہر چوہدری کی حویلی پر بھی حملہ کر دیا تھا۔ چوہدری حاکم علی اس علاقے کا سب سے بڑا زمیں دار تھا۔ کئی مربع زمین تھی۔ کہا جاتا تھا کہ اس کے گھر میں سونا بھرا ہوا تھا اور حقیقت بھی یہی تھی۔ بے پناہ دولت تھی اس کے پاس۔ ہندوؤں اور سکھوں نے اس دولت کے لیے اس کے گھر پر حملہ کیا تھا۔

چوہدری مرید احمد کی عمر اس وقت پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ بڑا کڑیل جوان تھا۔ اس نے ڈٹ کر حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ اس کے جسم پر کئی زخم آئے تھے۔ دائیں ٹانگ پر گھٹنے سے کچھ اوپر گنڈاسے کے کئی وار کیے تھے۔ وہ زخموں سے چور ہو کر بے ہوش ہو گیا تھا اور حملہ آور اسے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے۔

چوہدری مرید احمد کو ہوش آیا تو پتا چلا کہ اس کا باپ چوہدری حاکم علی اور گھر کے سارے افراد مارے گئے تھے۔ حملہ آور گھر کا سارا سامان لوٹ کر لے گئے تھے۔ ٹانگ کے زخم کی وجہ سے جسم میں زہر پھیلنے کا خدشہ تھا اس لیے اس کی ٹانگ گھٹنے کے اوپر سے کاٹ دی گئی تھی۔ تقسیم کا عمل مکمل ہونے کے بعد یہ انکشاف بھی ہوا کہ ان کی تقریباً دو مربع زمین سرحد کے دوسری طرف چلی گئی تھی اور اب چوہدری مرید احمد کے پاس صرف ساڑھے تین مربع زمین رہ گئی تھی۔

میں کمرے میں اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ قاتل جو کوئی بھی تھا، کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہوا تھا کیونکہ ....دروازہ اندر سے بند تھا۔ کھڑکی یا تو تازہ ہوا کے لیے کھلی چھوڑ دی گئی تھی یا اسے قاتل نے کسی طرح کھول لیا تھا۔ فی الحال یہ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا کہ قاتل ایک تھا یا ایک سے زیادہ۔

میں نے مسہری کے نیچے، اِدھر اُدھر اور ہر طرف دیکھ لیا لیکن آلۂ قتل نہیں ملا۔ مسہری کے سرہانے کی طرف دیوار میں تجوری نصب تھی۔ میں نے تجوری کے ہینڈل پر رومال رکھ کر اسے آہستگی سے گھمایا۔ تجوری کا دروازہ کھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ تجوری کے ایک خانے میں کچھ کاغذات بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ دو خانے خالی تھے۔ بیچ والے خانے میں بالکل کونے میں کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے اسے چٹکی میں پکڑ کر باہر نکال لیا۔ وہ کشتی کی شکل کی زنانہ انگوٹھی تھی جس میں ہیرا جڑا ہوا تھا۔ اس ایک انگوٹھی اور ان بکھرے ہوئے کاغذات کے سوا تجوری میں اور کوئی چیز نہیں تھی۔ تجوری کے قریب فرش پر چابیوں کا گچھا بھی پڑا ہوا تھا جسے میں نے اٹھا لیا۔ انہی میں سے کوئی ایک چابی اس تجوری کی بھی تھی۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ کھڑکی سے آنے والا جو بھی شخص تھا اس نے چوہدری مرید احمد کو قتل کرنے کے بعد اس تکیے کے نیچے سے چابیاں نکال کر تجوری کھولی تھی اور اس میں سے سب کچھ سمیٹ کر لے گیا تھا۔ دوسرا خیال یہ بھی تھا کہ وہ شخص کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی نیت چوری کی تھی۔ اس نے بڑی احتیاط سے چوہدری کے تکیے کے نیچے سے چابیوں کا گچھا نکالا اور تجوری کھول کر سب کچھ سمیٹ لیا اور ممکن ہے اس موقع پر چوہدری کی آنکھ کھل گئی ہو۔ اس نے چور کو دیکھ لیا لیکن چور نے اسے منہ سے آواز نکالنے کا موقع نہیں دیا اور اسے گرفت میں لے کر قتل کر دیا لیکن محض چوری والی بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی تھی۔ اگر وہ چور ہوتا تو آنکھ کھلنے کے بعد اس کے قابو میں آنے سے پہلے چوہدری مرید احمد کو چیخنے یا شور مچانے کا موقع ضرور مل جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ اگر وہ چیخا بھی تھا تو حویلی یا پڑوس میں کسی نے اس کی آواز نہیں سنی تھی کیوں کہ گھر کے نوکر لاش دریافت ہونے سے پہلے تک مطمئن تھے کہ چوہدری سو رہا ہے۔

تمام صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد میں نے ان لوگوں کی موجودگی میں مشیر نامہ تیار کیا اور دوسری کارروائی میں مصروف ہو گیا۔

کھڑکی کے باہر کی طرف کچی زمین تھی جہاں کچھ قدموں کے نشان نظر آ رہے تھے۔ وہ تمام نشان آپس میں گڈمڈ نظر آ رہے تھے کیوں کہ حویلی میں جمع ہونے والے بہت سے لوگ کمرے میں ہونے والی کارروائی دیکھنے کے لیے کھڑکی کے سامنے کھڑے تھے لیکن میں نے اپنی تسلی کر لینا ضروری سمجھا اور کھڑکی کے باہر والی جگہ کا جائزہ لینے لگا۔ قدموں کے کچھ نشان وہاں سے ہٹ کر حویلی کی بیرونی دیوار کی طرف جاتے ہوئے نظر آئے۔ دیوار کے ساتھ ایک ڈرم رکھا ہوا تھا۔ قدموں کے نشان اس ڈرم کے قریب جا کر ختم ہو گئے تھے۔ قدموں کے ان نشانات کو دیکھ کر اب میں اس نتیجے

پر پہنچا تھا کہ وہ کم از کم دو آدمی تھے جو اس ڈرم پر کھڑے ہو کر دیوار پر چڑھ گئے تھے اور کچھ دور تک دیوار پر چلتے ہوئے دیوار کے دوسری طرف ٹاہلی کے درخت کے ذریعے گلی میں اتر گئے تھے۔

یہاں ابتدائی تفتیش کے دوران ایک اور انکشاف میرے لیے بڑا دلچسپ ثابت ہوا تھا۔ چوہدری مرید احمد کو کتے لڑانے کا شوق تھا اور اس مقصد کے لیے اس نے پانچ چھ بڑے ہی خوف ناک قسم کے کتے پال رکھے تھے۔ ان کتوں کے لیے حویلی کے پچھواڑے میں کتا گھر بنا ہوا تھا۔ مزید دلچسپی کی بات یہ تھی کہ رات کو ایک کتا حویلی میں کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا اور کوئی اجنبی حویلی میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے فالتو لوگوں کو حویلی سے باہر نکلوا دیا اور برآمدے میں کرسی پر بیٹھ کر بھاتاں کو بلا لیا کیوں کہ گھر کے سارے کاموں کی دیکھ بھال اسی کے ذمے تھی۔

"چوہدری صاحب رات کو اپنے کمرے میں کس وقت گئے تھے؟" میں نے بھاتاں سے پوچھا۔

"رات کو روٹی کھانے کے تھوڑی دیر بعد وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تھے جی!" بھاتاں نے روتے ہوئے جواب دیا "وہ شام کو حکیم جی سے جوشاندہ لے کر آئے تھے۔ جب میں انہیں جوشاندہ دینے گئی تو انہوں نے کہا تھا کہ صبح انہیں نہ جگایا جائے۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، وہ خود ہی اٹھ جائیں گے۔"

"چوہدری کی بیوی میکے کب گئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"کل دوپہرے جی۔" بھاتاں نے جواب دیا "اس کا میکا تونا ریاں میں ہے۔ میں نے شیدے کو بھیج دیا ہے کہ وہ چوہدرانی کو یہاں لے آئے۔ ہائے بے چاری جوانی میں بیوہ ہو گئی۔" بھاتاں بین کرنے لگی۔

"اچھا اب رونا بند کر اور یہ بتا کہ ان میاں بیوی میں کوئی جھگڑا ہوا تھا؟" میں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

"نہ جی، کبھی نہیں۔" بھاتاں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "جس گھر میں دو برتن ہوں وہاں کھٹ راگ تو ہوتا ہی ہے نا جی۔ پر ان میاں بیوی میں کبھی لڑائی نہیں ہوئی۔"

"ایک بات اور۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "میں نے سنا ہے کہ ہر رات حویلی میں ایک کتا کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ کیا کل رات کتا نہیں کھولا گیا تھا؟"

"کھولا گیا تھا جی۔ میں نے خود ڈبو کو ادھر پھرتے ہوئے دیکھا تھا۔" بھاتاں نے سامنے آنگن کی طرف اشارہ کیا "میرا خیال ہے سویرے فجر ویلے کرمو نے وہ کتا حویلی کے پچھواڑے لے جا کر باندھ دیا تھا۔"

"کرمو کو بلاؤ منشی سلامت علی۔" میں نے قریب کھڑے منشی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں ادھر کھلوتا ہوں جی۔" قریب کھڑے ہوئے کرمو نے کہا۔

"ادھر کھلوتے کیا کر رہے ہو۔ ادھر آؤ میرے سامنے۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کرمو میرے سامنے آگیا۔ وہ دبلا پتلا سا آدمی تھا۔ عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ لٹھے کی میلی سی دھوتی اور کھدر کا کرتہ پہنے ہوئے تھا۔ دو تین دن کا شیو بڑھا ہوا تھا "کتا صبح تم نے بند کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"کتا...... نہیں جی..... میں تو فجر ویلے ڈنگروں کے لیے پٹھے لینے کے لیے چلا گیا تھا جی۔" کرمو نے جواب دیا۔

"رات کو کتا تم نے کھولا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"آہو جی! رات کو تو میں نے ہی ڈبو کو کھولا تھا۔ پر صبح تو میں نے اسے نہیں دیکھا جی۔" کرمو نے کہا۔

اور پھر یہ انکشاف ہوا کہ صبح حویلی کے کسی نوکر نے کتے کو نہیں دیکھا تھا۔ اسی وقت کتے کی تلاش شروع ہو گئی۔ حویلی کے ایک کونے میں سوکھی ہوئی لکڑیوں کا بہت بڑا انبار پڑا تھا۔ ایک آدمی لکڑیوں کے اس انبار کے پیچھے چلا گیا اور دوسرے ہی لمحے اس کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

"منشی جی۔ ڈبو مرا پڑا ہے۔ لکڑیوں کے اس ڈھیر کے پیچھے۔"

میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر لکڑیوں کے اس ڈھیر کے پیچھے پہنچ گیا۔ دیوار اور لکڑیوں کے انبار کے درمیان وہ کتا مرا پڑا تھا۔ اس کی زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور آنکھیں ابلی ہوئی تھیں۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس کتے کو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا لیکن حیرت کی بات تھی کہ اتنا خوف ناک کتا کسی کے قابو میں کیسے آیا ہوگا۔

اچانک ایک اور خیال میرے ذہن میں ابھرا۔ چوہدری مرید احمد کا قاتل جو کوئی بھی تھا کم از کم اس کتے کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اگر اجنبی ہوتا تو کتا اسے دیکھ کر بھونکتا ضرور۔ نوکروں سے پوچھ گچھ کی گئی تو انہوں نے بتایا کہ رات کے کسی بھی حصے میں انہوں نے کتے کے بھونکنے کی آواز نہیں سنی تھی۔

میں نے اس بات کو بھی ذہن کے ایک گوشے میں محفوظ کر لیا اور بعض دوسرے لوگوں کے بیانات سننے لگا۔ اس دوران میں حویلی کے باہر ایک شور سا اٹھا۔ عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ معلوم ہوا کہ چوہدری مرید احمد کی بیوی تونا ریاں سے واپس آگئی ہے۔

چوہدری مرید احمد کی بیوہ حویلی میں داخل ہوئی تو اس کے ساتھ گاؤں کی اور بھی بہت سی عورتیں تھیں جو رو رو کر سینہ کوبی کر رہی تھیں۔ بھاتاں نے دوڑ کر چوہدری کی بیوہ کو سینے سے لپٹا لیا اور بین کرنے لگی۔

بڑا رقت آمیز منظر تھا۔ ہر آنکھ اشک بار نظر آرہی تھی۔ پولیس کی ملازمت میں رہتے ہوئے میں اگرچہ اس قسم کے حالات کا عادی ہو چکا تھا لیکن اس وقت میں بھی دل گرفتہ سا ہو گیا تھا۔ عورتیں چوہدرانی کو اس کمرے میں لے گئی تھیں جہاں چوہدری کی لاش رکھی ہوئی تھی پھر اچانک شور مچا کہ چوہدرانی کو غش آگیا ہے۔

عورتیں اسے اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے آئیں اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگیں۔

پورا گاؤں حویلی میں جمع ہو گیا تھا۔ اسکول میں کھیلوں کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسکول کے بہت سے لڑکے حویلی میں آ گئے تھے اور کچھ اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔

اس صورتِ حال میں میرا کام کچھ مشکل ہو گیا تھا۔ میں نے تفتیش روک دی۔ چوہدری مرید احمد کے بیٹے شبیر احمد کے بارے میں پتا چلا تھا کہ وہ کسانوں کا کوئی جھگڑا چکانے کے لیے جھگیاں پنڈ گیا ہوا تھا۔ آج اسے تیسرا دن تھا لیکن ابھی تک وہ واپس نہیں آیا تھا۔ چوہدری مرید احمد کے قتل کا انکشاف ہونے کے بعد ایک بندہ جھگیاں پنڈ بھی دوڑا دیا گیا تھا تاکہ شبیر احمد کو خبر دی جا سکے۔ وہ بندہ کچھ دیر پہلے ہی واپس آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ شبیر احمد آج صبح سویرے ہی اپنے کسی دوست سے ملنے کے لیے شہر چلا گیا تھا۔ جھگیاں پنڈ کے ایک آدمی کو اس کا پتا لگانے کے لیے شہر بھیج دیا گیا تھا۔

قتل کی وارداتوں میں عام طور پر لاش کا پوسٹ مارٹم ضرور ہوتا ہے لیکن ایسی باتوں کا خیال شہروں میں رکھا جاتا ہے جہاں اس قسم کی سہولتیں موجود ہوتی ہیں جب کہ گاؤں دیہاتوں میں ان باتوں پر توجہ نہیں دی جاتی۔ یوں بھی شہر بہت دور تھا اور اگر لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے شہر کے اسپتال میں بھیجا جاتا تو اس میں کئی گھنٹے لگ جاتے۔ موسم میں کچھ حدت بھی آ گئی تھی اور لاش کے خراب ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس کے علاوہ چوہدری کی بیوی اور گاؤں کے معززین بھی لاش کے پوسٹ مارٹم پر آمادہ نہیں تھے۔ اس لیے میں نے تجہیز و تکفین کی اجازت دے دی اور اپنا کام سمیٹ کر تھانے واپس آ گیا۔

تھانے پہنچ کر میں نے ایس ایچ او انسپکٹر مشتاق کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور رپورٹ تیار کرنے لگا۔

○☆○

رپورٹ میں اگرچہ ڈکیتی کی واردات تحریر کی گئی تھی لیکن میرا دل نہیں مانتا تھا کہ یہ محض ڈکیتی کی واردات تھی۔ مجھے نجانے کیوں یہ یقین تھا کہ چوہدری مرید احمد کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت قتل کیا گیا تھا لیکن قتل کی اصل وجہ ابھی تک سامنے نہیں آئی تھی۔ یہ بات میں پہلے بھی کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ قتل کی وجہ کا تعین ہو جائے تو تفتیش سہل ہو جاتی ہے اور قاتل تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔

یہاں دو تین باتیں سامنے آئی تھیں۔ لوگوں کے بیانات کی روشنی میں یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ چوہدری مرید احمد کی کسی سے دشمنی نہیں تھی۔ وہ نہ صرف اپنے گاؤں بلکہ آس پاس کے دیہاتوں میں بھی بے حد مقبول اور ہر دل عزیز شخص تھا۔ وہ اس علاقے کا سب سے بڑا زمیں دار تھا لیکن اس میں گھمنڈ اور نخوت نام کو نہیں تھا۔ اس کے مزارع بھی اس سے خوش تھے۔

قاتل کے بارے میں یہ بات طے تھی کہ وہ اس حویلی کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اگر اس کا تعلق براہِ راست اس حویلی سے نہیں بھی تھا تو یہاں اس کی بکثرت آمد و رفت تھی کیوں کہ کتے اس سے مانوس تھے۔ اگر وہ شخص حویلی کے لیے اجنبی ہوتا تو اسے حویلی کی دیوار پھاندتے دیکھ کر حویلی میں گشت کرنے والا کتا ڈبو ضرور بھونکتا لیکن وہ شخص کتے کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ کتا اس کے پاس ضرور آیا ہوگا اور اس شخص نے موقع پا کر کتے کو گردن سے دبوچنے کے بعد گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا ہوگا۔ اس سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ شخص کتنا طاقت ور ہوگا۔ ڈبو جیسے قد آور اور خوف ناک کتے کو گلا گھونٹ کر ہلاک کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

چوہدری مرید احمد کے بارے میں ایک اور خاص بات جو معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ ...... پانچ دن پہلے چودھویں کی شب اس کے دو کتوں نے لڑائی میں حصہ لیا تھا اور دونوں کتوں نے مقابلے جیتے تھے۔ ان مقابلوں پر ہزاروں روپے کی شرطیں لگی ہوئی تھیں۔ ہارنے والے دونوں کتے بھینی کے ایک زمیں دار ملک عبدالرحمٰن کے تھے۔ اپنے کتوں کی شکست پر ملک عبدالرحمٰن اور چوہدری مرید احمد میں کچھ تلخ کلامی بھی ہوئی تھی۔ ممکن ہے بات بڑھ جاتی مگر لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا تھا۔ ملک عبدالرحمٰن اس قدر غصے میں تھا کہ اس نے ہارنے والے اپنے دونوں کتوں کو لوگوں کے سامنے گولیاں مار کر ہلاک کر ڈالا تھا۔

جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ کتے لڑانا زمیں داروں کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ وہ کتوں کی پرورش پر ہزاروں روپے خرچ کرتے تھے اور ان کی لڑائی پر ہزاروں روپے کی شرط بھی لگتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک زمیں دار نے اپنی آدھا مربع زمین کتوں کی لڑائی پر لگائی جانے والی شرط میں ہار دی تھی۔ بعد میں اس نے اپنے کتے کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ اس قسم کی بہت سی مثالیں موجود تھیں۔ کسی زمیں دار کو اپنے کتے پر بڑا فخر ہوتا لیکن جب وہ کتا لڑائی میں ہار جاتا تو دل برداشتہ ہو کر وہ اپنے کتے ہی کو موت کے گھاٹ اتار دیتا اور اس طرح زمیں داروں میں بھی دشمنیاں چل پڑتیں۔

مجھے کہیں نہ کہیں سے تفتیش کا آغاز کرنا ہی تھا۔ لہٰذا میں نے بھینی کے زمیں دار ملک عبدالرحمٰن سے تفتیش شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا اور بھینی پہنچ گیا۔ میرے ساتھ اے ایس آئی حامد علی بھی تھا۔ جب ہم بھینی پہنچے تو اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ ملک عبدالرحمٰن کھیتوں پر گیا ہوا تھا۔ ایک آدمی کو اسے اطلاع دینے کے لیے بھیج دیا گیا اور گاؤں کا ایک اور زمیں دار اکبر کھوکھر ہمیں اپنی حویلی میں لے آیا۔ اس کے ایک نوکر نے ہمارے گھوڑے ایک درخت کے نیچے باندھ دیے تھے اور انہیں پانی اور چارا ڈالنے لگا تھا۔

ہم اکبر کھوکھر کی بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ فوراً ہی لسی پانی کا انتظام ہو گیا۔ اس دوران میں اکبر کھوکھر سے زمیں دار ملک

عبدالرحمٰن کے بارے میں پوچھنے لگا۔ اس نے بتایا کہ ملک عبدالرحمٰن دراصل مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر کا رہنے والا تھا۔ وہاں بھی ان کی زمیں داری تھی۔ تقسیم کے بعد وہ لوگ لاہور آگئے تھے اور کلیم میں بھینی کے علاقے میں آدھا مربع زمین لے لی تھی۔ اس زمین کا بیش تر حصہ بنجر تھا جسے اس نے بڑی محنت سے قابلِ کاشت بنایا تھا۔

"خیر تو ہے ملک جی!" اکبر کھوکھر نے بڑے رازدارانہ لہجے میں پوچھا "آپ ملک عبدالرحمٰن کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"ہمیں لوگوں کے بارے میں تفتیش تو کرنی ہی پڑتی ہے۔" میں نے کہا "سنا ہے چند روز پہلے جب کتوں کی لڑائی ہوئی تھی تو ملک عبدالرحمٰن اور چوہدری مرید احمد میں کوئی جھگڑا بھی ہوا تھا؟"

"آہو جی!" اکبر کھوکھر نے جواب دیا "ملک عبدالرحمٰن ذرا جذباتی قسم کا بندہ ہے۔ وہ اپنے کتوں کی شکست برداشت نہیں کرسکا تھا۔ چوہدری سے لڑ بیٹھا تھا۔ اگر اس کے کتے ہار گئے تھے تو اس میں چوہدری کا کیا قصور۔۔۔۔ وہ تو اس قدر غصے میں آگیا تھا کہ اس نے پستول نکال لیا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا ورنہ اس رات ایک آدھ قتل ہو جاتا۔ بعد میں اس نے اپنا غصہ اتارنے کے لیے اپنے کتوں ہی کو گولی مار دی تھی۔"

"کیا اس وقت آپ بھی وہاں موجود تھے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی!" اکبر کھوکھر نے سر ہلایا "سب کچھ میرے سامنے ہی ہوا تھا۔ ملک عبدالرحمٰن کی تو مت ہی ماری گئی تھی۔ میں اس کو پکڑ کر پاسے نہ لے جاتا تو بات بڑھ جاتی اور پتہ نہ کچھ ہو جاتا۔"

"اس کے بعد عبدالرحمٰن نے چوہدری کے بارے میں کوئی ایسی بات کی تھی جس سے یہ پتا چلتا ہو کہ وہ چوہدری سے اپنے کتوں کی شکست کا بدلہ لینا چاہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ راستے بھر بولتا آیا تھا جی لیکن میرا خیال ہے کہ وہ محض باتیں ہی تھیں۔ عبدالرحمٰن ایسا آدمی نہیں ہے کہ۔۔۔۔"

"لیکن۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "جو شخص ایک معمولی سی بات پر اپنے پالے ہوئے کتوں کو گولی مار سکتا ہے اس سے کسی بھی بات کی توقع کی جاسکتی ہے۔"

"یہ بات تو ہے جی!" اکبر کھوکھر نے سر ہلایا "پچھلے سال اس نے محض اس بات پر اپنے ایک مزارع کی ٹانگ توڑ دی تھی کہ کتے کو وقت پر راتب نہیں ڈالا گیا تھا۔"

میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اکبر کھوکھر کا ایک نوکر بیٹھک میں داخل ہوا۔ "وہ ملک صاب آگئے نے جی، اپنی حویلی میں۔"

میں ایک دم اٹھ گیا "اچھا کھوکھر صاحب۔ میں آپ سے پھر بات کروں گا۔ ذرا ملک عبدالرحمٰن سے مل آؤں۔"

"آپ نے دوپہر کی روٹی یہیں کھانی ہے جی! میں نے گھر میں کہہ دیا ہے۔ آپ فارغ ہو کر ادھر ہی آجائیں۔" اکبر کھوکھر نے کہا۔ وہ اپنی حویلی کے پھاٹک تک مجھے چھوڑنے آیا تھا۔

میں جب ملک عبدالرحمٰن کی حویلی میں داخل ہوا تو ملک عبدالرحمٰن برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ وہ ایک روایتی زمیں دار تھا جو دوسروں پر اپنا دبدبہ رکھنا جانتا تھا۔ سفید شلوار قمیص، کالی واسکٹ اور سر پر کُلّے والی پگڑی جس کا شملہ تقریباً ایک بالشت اونچا تھا۔ پیروں میں تلے والا کھُسّا تھا اور گلے میں پستول کی پیٹی تھی۔ ہولسٹر سے پستول کا دستہ بھی جھانک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شہتوت کی ایک چھڑی تھی۔ دو نوکر برآمدے میں ایک طرف سہمے ہوئے سے کھڑے تھے۔

ملک عبدالرحمٰن کو پتا چل گیا تھا کہ میں اکبر کی حویلی میں بیٹھا ہوا ہوں پھر بھی وہ وہاں نہیں آیا تھا اور اب بھی وہ میرے استقبال کو آگے نہیں بڑھا تھا بلکہ برآمدے میں کھڑا میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر گھمنڈ اور تکبر کے تاثرات نمایاں تھے۔

"آیئے ملک جی!" اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "سنا ہے آپ خاص طور پر مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔"

"ٹھیک سنا ہے آپ نے۔ میرا خیال ہے اطمینان سے بیٹھ کر بات کی جائے۔ یوں کھڑے کھڑے تو بات نہیں ہوسکتی نا۔" میں نے کہا۔

"آئیں بیٹھک میں آجائیں لیکن میں ذرا جلدی میں ہوں۔ مجھے چوہدری حشمت سے ملنے لکھوڈہر جانا ہے۔" اس نے بیٹھک میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"صرف چند باتیں پوچھنی ہیں۔ اس کے بعد آپ جہاں چاہیں، چلے جائیں۔" میں نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "جس رات کتوں کی لڑائی ہوئی تھی اس رات چوہدری مرید احمد سے آپ کا جھگڑا بھی ہوا تھا۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ چوہدری مرید احمد کو میں نے قتل کیا ہے؟" اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔ لہجے میں ناگواری نمایاں تھی۔

"میں نے یہ نہیں کہا لیکن تفتیش کرنا میرا فرض ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بڑی نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہیں۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"ہاں جھگڑا ہوا تھا لیکن وہ وقتی غصہ تھا۔" ملک عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔

"اور وہ غصہ آپ نے اپنے کتوں پر اتارا۔ انہیں گولی مار دی۔" میں نے اسے گھورا۔

"وہ بڑے حرام خور ثابت ہوئے تھے۔" ملک عبدالرحمٰن نے جواب دیا "میں نے ان پر ہزاروں روپے خرچ کیے تھے۔ دو آدمی ان کی خدمت پر مامور کر رکھے تھے لیکن انہوں نے سیکڑوں لوگوں کے سامنے مجھے ذلیل کردیا۔ میں انہیں گولی نہ مارتا تو اور کیا کرتا۔"

"آپ نے چوہدری مرید احمد پر بھی پستول تانا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو ایسے ہی غصے میں میرا ہاتھ پستول پر پہنچ گیا تھا۔ میں ایسا بے وقوف بھی نہیں ہوں کہ کسی معمولی سی بات پر کسی بندے کو مار

دیتا۔ کتوں کا کیا ہے جی۔ کتے آخر کتے ہی ہیں۔ انسانوں سے ان کی برابری تو نہیں کی جا سکتی نا؟"

"لیکن ایک سال پہلے آپ نے محض اس لیے ایک انسان کی ٹانگ توڑ دی تھی کہ اس نے آپ کے کتے کو وقت پر راتب نہیں ڈالا تھا۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"اوہ!" وہ چونک گیا "یہ بات آپ کو یقیناً اکبر کھوکھر نے بتائی ہوگی۔"

"سارا گاؤں جانتا ہے۔" میں نے کہا "پرسوں رات آپ کہاں تھے؟" یہ سوال میں نے اچانک ہی کیا تھا۔

"اس کا مطلب ہے آپ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔" اس نے ناگوار سے لہجے میں کہا "آپ جانتے ہیں' میں اس علاقے کا ایک معزز زمیں دار ہوں اور آپ جیسے معمولی پولیس آفیسر مجھے اس طرح دھمکا نہیں سکتے۔"

"میں دھمکی نہیں دے رہا ملک عبدالرحمٰن!" میں نے بدستور پرسکون لہجے میں کہا "پانچ روز پہلے تم نے درجنوں لوگوں کی موجودگی میں ایک آدمی پر پستول تان لیا تھا۔ وہ آدمی کل رات قتل ہو گیا۔ سب سے پہلے تم پر ہی اس کے قتل کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔ میرے سوال کا جواب دو ورنہ یہی معمولی سا پولیس آفیسر پھانسی کا پھندا تمہارے گلے میں فٹ کر دے گا۔"

ملک عبدالرحمٰن تلملا کر رہ گیا۔ اس کی گرم دماغی واقعی اسے کسی مصیبت میں پھنسا گئی تھی لیکن میری بات شاید اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا "کل رات میں لکھوڈہر میں تھا' چوہدری حشمت علی کے گھر۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "چوہدری حشمت علی دراصل اپنی کچھ زمین بیچنا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں میری اس سے بات چیت چل رہی ہے۔ میں کل شام کو گیا تھا اور رات اس کے گھر پر رہا تھا۔"

"تمہیں چوہدری مرید احمد کے قتل کی اطلاع کب اور کہاں ملی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"میں کل صبح نو بجے کے قریب لکھوڈہر سے واپس آ رہا تھا کہ پنڈ جھگیاں کے قریب مجھے اطلاع ملی کہ چوہدری مرید احمد کو قتل کر دیا گیا ہے۔" ملک عبدالرحمٰن نے جواب دیا "میں نے وہیں سے اپنے گھوڑے کا رخ سید پور کی طرف موڑ دیا تھا۔ لڑائی جھگڑے اور ناراضگی تو زندہ انسانوں سے ہوتی ہے۔ مرنے کے بعد کیسی ناراضگی۔"

"ٹھیک ہے ملک عبدالرحمٰن!" میں نے اٹھتے ہوئے کہا... "فی الحال تو تم سے یہی کچھ پوچھنا تھا۔ ضرورت پڑی تو پھر ملاقات کروں گا۔"

میں اے ایس آئی حامد علی کے ساتھ حویلی سے باہر آیا۔ چوک پر کریانے کی دکان کے سامنے چند آدمی جمع تھے۔ وہ غالباً یہی چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ پولیس ملک عبدالرحمٰن کے گھر کیوں آئی ہے۔ میں ابھی دکان کے سامنے پہنچا ہی تھا کہ دکان دار نے برف میں دبی ہوئی سوڈے کی دو بوتلیں کھولیں اور ایک بوتل بڑے ادب سے میرے ہاتھ میں دے دی اور دوسری حامد علی کی طرف بڑھا دی۔ اس وقت واقعی مجھے پیاس لگ رہی تھی۔ میں نے بوتل کا آخری گھونٹ بھرا ہی تھا کہ اکبر کھوکھر آ گیا اور ہمیں اپنی حویلی میں لے گیا۔ دو تین اور آدمی بھی ہمارے ساتھ آ گئے تھے۔

کھانا بہت مرغن اور لذیذ تھا۔ کھانے کے بعد غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ اس سے پہلے کہ میں نیند سے مغلوب ہو جاتا' میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور وہاں سے روانگی کی تیاری کرنے لگا۔

میرا ارادہ تھا کہ میں لکھوڈہر سے ہوتا ہوا جاؤں گا کیوں کہ میں چوہدری حشمت سے ملک عبدالرحمٰن کے بیان کی تصدیق بھی کرنا چاہتا تھا۔

یوں تو لکھوڈہر جانے کے لیے اور بھی کئی راستے تھے لیکن میں نے پنڈ جھگیاں کی طرف سے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس پنڈ کے ساتھ ہی وہ میدان تھا جہاں کتوں کی لڑائی ہوا کرتی تھی۔ اس میدان کے کنارے پر اینٹیں بنانے کا ٹوٹا پھوٹا بھٹا تھا اور اس سے تقریباً سو گز آگے پنڈ تھا۔ پنڈ تک پہنچنے کے لیے ایک بہت بڑے جوہڑ کے قریب سے گزرنا پڑتا تھا۔ بھینی کی طرف جانے والا باقاعدہ راستہ بھی اسی پنڈ کے قریب سے گزرتا تھا لیکن وہ راستہ اس پنڈ کے دوسری طرف تھا۔

جوہڑ کے گندے پانی میں ڈنگر اور انسانوں کے بچے ایک ساتھ نہا رہے تھے۔ ایک کنارے پر دو عورتیں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھیں۔ گاؤں دیہاتوں میں جوہڑ بڑے کام کی چیز ہوتے ہیں۔ یہاں مویشی بھی نہاتے ہیں' کپڑے بھی دھوئے جاتے ہیں۔ اس میں سے مٹی نکال کر گھروں میں پوچا بھی کیا جاتا ہے' جونکیں بھی پکڑی جاتی ہیں جو مختلف بیماریوں کے علاج کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ اگر کوئی اور بندوبست نہ ہو تو پینے کا پانی بھی جوہڑ ہی سے حاصل کیا جاتا ہے۔

پنڈ جھگیاں میں ہمیں وہ گھر تلاش کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی جہاں چوہدری مرید احمد کا بیٹا شبیر احمد آیا تھا۔ اس پنڈ میں بھی چوہدری مرید احمد کی تقریباً آدھا مربع زمین تھی جو لکھوڈہر کی زمینوں سے ملی ہوئی تھی۔ یہاں پہنچ کر پتا چلا کہ پانی کی باری پر کاشت کاروں میں جھگڑا ہو گیا تھا جس کا فیصلہ کرنے کے لیے شبیر احمد کو یہاں آنا پڑا تھا۔ سید پور اگرچہ یہاں سے صرف چھ سات میل دور تھا لیکن شبیر احمد تین دن یہاں رہ گیا تھا۔ پتا چلا کہ وہ اکثر یہاں آتا رہتا تھا اور بعض اوقات کئی کئی روز یہاں رہ جاتا تھا۔

یہ گاؤں پچاس ساٹھ گھروں پر مشتمل تھا اور یہاں ان تین زمیں داروں کے مزارع رہائش پذیر تھے جن کی زمینیں اس علاقے میں تھیں۔ ان میں ایک چوہدری حشمت تھا جو لکھوڈہر میں رہائش پذیر تھا۔ دوسرا چوہدری مرید احمد اور تیسرا چوہدری عبدالغفور۔ وہ بھی لکھوڈہر ہی کا رہنے والا تھا۔ یہ زمینیں چوں کہ لکھوڈہر اور سید

پور سے دور تھیں اس لیے ان کے مزارعین نے یہاں اپنی چھوٹی سی بستی بنالی تھی۔ پہلے یہاں جھگیاں ہوا کرتی تھیں مگر اب پکے مکان بن گئے تھے اور ایک پورا پنڈ آباد ہو گیا تھا لیکن اس کا نام اب بھی جھگیاں ہی تھا۔ تینوں زمیں دار بھی اکثر و بیشتر یہاں آکر ٹھہرتے تھے۔ یہاں ان کے اپنے مکان بھی تھے۔ چوہدری مرید احمد کا بھی تین کمروں پر مشتمل ایک مکان تھا۔ اس علاقے میں اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے کبھی وہ خود آجاتا تھا اور کبھی اس کا بیٹا شبیر احمد۔۔۔۔ لیکن اب زیادہ تر شبیر احمد ہی آیا کرتا تھا۔

شبیر احمد تین دن پہلے یہاں آیا تھا۔ اس کے نوکروں کے کہنے کے مطابق پانی کی باری والا جھگڑا تو اسی روز طے ہو گیا تھا لیکن وہ واپس نہیں گیا تھا۔ اس شام شہر سے اس کے دو دوست آگئے تھے جن کے بارے میں انکشاف ہوا کہ وہ پینے پلانے کے شوقین تھے اور شہر سے شراب کی بوتلیں لے کر آئے تھے۔

چوہدری مرید احمد کے بیٹے شبیر احمد کو میں نے نہیں دیکھا تھا لیکن انہی لوگوں سے سنا تھا کہ وہ بڑا گھبرو جوان تھا۔ اس نے شہر کے اسکول سے میٹرک تک تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ یہاں آنے والے اس کے اسکول کے زمانے ہی کے دوست تھے۔

میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال ابھرا۔ تین جوان آدمی ہوں، شراب کی بوتلیں ہوں تو شباب کی خواہش خود بخود دل میں مچلنے لگتی ہے۔ اسی خیال کے تحت میں نے شبیر احمد کے نوکر سے دریافت کیا۔ "یہاں کوئی عورت بھی آئی ہے۔ میرا مطلب ہے شبیر احمد اور اس کے دوستوں کا دل بہلانے کے لیے؟"

"نن۔۔۔۔ نہیں جی۔" نوکر میرے اس سوال پر ایک دم گڑبڑا گیا "وہ تو جی صرف پینے پلانے کا شوق ہی پورا کرتے ہیں۔ کوئی عورت یہاں کبھی نہیں آئی۔"

"سوچ لو۔" میں نے اسے گھورا "اگر بعد میں مجھے پتا چلا کہ یہاں کوئی عورت بھی آئی ہے تو تمہیں پیپل کے اس درخت پر الٹا ٹانگ دوں گا۔"

"مم۔۔۔۔ میں سچ کہتا ہوں جی! یہاں کوئی عورت نہیں آئی۔" اس نے جواب دیا۔

"شبیر احمد یہاں سے کب گیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ صبح سات بجے ہی اپنے دوستوں کے ساتھ شہر چلا گیا تھا جی اور پھر نو بجے ایک آدمی نے آکر بتایا تھا کہ سید پور میں بڑے چوہدری صاحب کو قتل کر دیا گیا ہے۔" نوکر نے کہا۔

میں کچھ دیر مزید وہاں کھڑا لوگوں سے پوچھ گچھ کرتا رہا۔ اس دوران وہاں گاؤں کے تین چار آدمی اور بھی کھڑے تھے پھر میں وہاں سے رخصت ہو کر لکھوڈیر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اے ایس آئی حامد علی میرے ساتھ تھا۔ اس مرتبہ بھی ہم نے کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی کا راستہ اختیار کیا تھا۔ لکھوڈیر وہاں سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھا اور وہاں کے دو اور تین منزلہ مکان صاف نظر آرہے تھے۔

ابھی ہم نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک آدمی اچانک ہی کھیتوں سے نکل کر پگڈنڈی پر ہمارے سامنے آگیا۔ مجھے اس شخص کو پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ جب میں گاؤں میں لوگوں سے پوچھ گچھ کر رہا تھا تو یہ بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا تو میں نے گھوڑی کی لگام کھینچ لی۔ اس شخص کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی، وہ میلی سی دھوتی اور کرتہ پہنے ہوئے تھا۔

"کیا بات ہے کون ہو تم؟" میں نے اسے گھورا۔

"میں دُلا کمہار ہوں جی! اسی پنڈ میں رہتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"میں نے تمہیں پنڈ میں دیکھا تھا۔ کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ جی! آپ نے پوچھا تھا نا کہ چھوٹے چوہدری کے پاس کوئی عورت بھی آئی ہے یا نہیں۔ چوہدری کے نوکر نے جھوٹ بولا تھا جی۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ان کے پاس کوئی عورت آئی ہے۔ کون ہے وہ؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"میں آپ کو بتاتا ہوں جی! پر میرا نام نہ لینا جی۔" وہ ڈر بھی رہا تھا۔

"اگر تم کسی پر جھوٹا الزام لگاؤ گے تو میں تمہاری کھال کھینچ لوں گا۔ بتاؤ کون ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

"وہ جی۔۔۔۔ تاجے تیلی کی بیوی زینو۔" دُلے کمہار نے کہا "اس کے ویاہ کو چھ ورے ہو گئے ہیں پر ابھی تک لنڈورے ہی ہیں۔ زینو بڑی کھلی ڈلی مٹیار ہے جی! تاجے کے بس میں نہیں آئی۔ پنڈ کے کئی گھروں میں لڑائی ہوتی رہتی ہے جی اس کی وجہ سے۔ پر جب سے چھوٹے چوہدری کی نظروں میں آئی ہے، کسی اور کے پاس نہیں جاتی۔ چھوٹا چوہدری جب بھی یہاں آتا ہے، وہ بھی رات کو چھپ کر آجاتی ہے۔"

"کوئی اور بھی جانتا ہے اس کے بارے میں؟" میں نے پوچھا۔

"سارے پنڈ والے جانتے ہیں جی! پر چھوٹے چوہدری کے ڈر سے کوئی زبان نہیں کھولتا۔ آپ کسی کو نہ بتائیں جی کہ میں نے آپ کو بتایا ہے۔"

"شبیر احمد کے شہری دوستوں کے علاوہ گاؤں کا کوئی آدمی بھی رات کو اس کے پاس رہتا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں جی!" دُلے کمہار نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "تین چار دن پہلے چھوٹا چوہدری یہاں اکیلا ہی آیا تھا۔ اس کے دوست شام کو آئے تھے مگر کل صبح جب وہ جانے لگے تو ان کے ساتھ گاما بھی تھا۔ پتا نہیں وہ کب آیا تھا۔"

"یہ گاما کون ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"چوہدری کے پنڈ کا موچی ہے جی۔" ڈُلے نے جواب دیا۔ "کبھی کبھی چھوٹے چوہدری کے ساتھ آجاتا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور گھوڑی کو آگے بڑھا دیا۔

"میرا نام کسی کو نہ بتائیں جی!" ڈُلے نے کہا۔

میں نے اس کی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور اے ایس آئی حامد علی کو چلنے کا اشارہ کر دیا۔

لکھوڈہر بہت بڑا گاؤں تھا۔ کسی پرانے شہر کی طرح تنگ تنگ سی گلیاں اور دو دو تین تین منزلہ پکے مکان۔ چوہدری حشمت کا مکان گاؤں کے شروع ہی میں تھا۔ وہ اس وقت گھر پر ہی موجود تھا۔ اس نے بڑی عزت سے ہمیں بیٹھک میں بٹھایا اور اندر پیغام بھجوا دیا کہ ہمارے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کیا جائے۔ اس دوران ہم باتیں کرتے رہے۔ میں جلد ہی اصل موضوع پر آگیا۔

"چوہدری صاحب! یہ بتائیں کہ ملک عبدالرحمٰن پرسوں رات یہاں سے کس وقت واپس گیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ملک عبدالرحمٰن۔" چوہدری حشمت سوچ میں پڑ گیا "وہ پرسوں رات آٹھ بجے روٹی کھا کر یہاں سے گیا تھا۔ میں نے کہا بھی تھا کہ رات یہیں رہ جاؤ مگر وہ نہیں رکا۔"

چوہدری حشمت کے اس جواب پر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ ملک عبدالرحمٰن نے کہا تھا کہ وہ رات چوہدری حشمت کے گھر رہا تھا اور صبح واپس جاتے ہوئے جھگیاں پنڈ کے قریب اسے چوہدری مرید احمد کے قتل کی اطلاع ملی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس نے جھوٹ کیوں بولا تھا۔ کیا چوہدری مرید احمد کے قتل میں اس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟

"وہ آپ کے پاس کسی کام سے آیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" چوہدری حشمت نے جواب دیا "دراصل میں نے لاہور شہر میں میکلوڈ روڈ پر ایک بڑے ہوٹل کا سودا کیا ہے۔ اس کے لیے مجھے رقم کی ضرورت تھی۔ میں نے سوچا کہ زمین کا ایک ٹکڑا بیچ دوں۔ میرے بیٹے پڑھ لکھ گئے ہیں جی۔ وہ چاہتے ہیں کہ زمیں داری چھوڑ کر شہر میں کوئی کاروبار کیا جائے۔ ہوٹل کا سودا دراصل میرے بڑے بیٹے ہی نے کیا ہے اور اسی کے لیے زمین بیچ رہا ہوں۔"

"اور ملک عبدالرحمٰن آپ سے وہ زمین خریدنا چاہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"زمین کے لیے دراصل دو تین آدمیوں سے میری بات چل رہی ہے۔" چوہدری حشمت نے جواب دیا "میری وہ زمین چوہدری مرید احمد کی زمین سے ملی ہوئی ہے۔ مرید احمد بھی وہ زمین خریدنا چاہتا تھا۔ اس سے بھی میری بات چل رہی تھی۔ میرا اس سے سودا ہو جاتا لیکن اس کے مقدر میں میری آدھا مربع زمین نہیں، اپنی زمین کا دو گز ٹکڑا لکھا تھا۔"

"ملک عبدالرحمٰن سے معاملہ طے نہیں ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ قیمت بہت کم لگا رہا ہے۔" حشمت نے جواب دیا۔

"ویسے یہ ملک عبدالرحمٰن کیسا آدمی ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں اس کے بارے میں زیادہ تو نہیں جانتا ویسے میرے خیال میں وہ اکھڑ اور تیز مزاج کا آدمی ہے۔" چوہدری حشمت نے جواب دیا۔

میں مزید کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اس کا ایک نوکر بیٹھک میں داخل ہوا۔ اس نے چوہدری حشمت کے کان میں کوئی سرگوشی کی اور چوہدری "ابھی آیا" کہہ کر باہر چلا گیا۔ اس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔

"کیا قصہ ہے ملک جی!" وہ میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ملک عبدالرحمٰن پر آپ کو کسی قسم کا شک ہے؟"

"شک کسی بھی تحقیق کی بنیاد ہوتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر کسی پر شک نہ ہو تو اس کے بارے میں تحقیق کیسے کی جائے گی۔ ویسے یہ بندہ کیا پیغام لے کر آیا تھا؟"

میرا یہ سوال سن کر چوہدری حشمت چونک سا گیا۔ دراصل بیٹھک کی کھڑکیاں گلی کی طرف تھیں۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور سامنے پردے پڑے ہوئے تھے۔ ایک کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا ہوا تھا اور جس جگہ میں بیٹھا ہوا تھا وہاں سے کھڑکی کے راستے گلی کا کچھ حصہ نظر آرہا تھا۔ میں نے اس آدمی کو گلی میں دیکھ لیا تھا جو بڑے رازدارانہ انداز میں چوہدری حشمت سے باتیں کر رہا تھا۔ اس شخص کو میں نے آج صبح ہی بھینی میں ملک عبدالرحمٰن کی حویلی میں دیکھا تھا۔

"او..... وہ بندہ۔" چوہدری حشمت نے کہا "ملک عبدالرحمٰن کا نوکر ہے۔ وہ یہ پیغام لے کر آیا تھا کہ اگر مجھے زمین کا سودا منظور ہو تو وہ کل بیعانے کی رقم لے کر آجائے۔"

اتنے میں چوہدری کا نوکر کھانے پینے کی چیزوں سے بھری ہوئی ٹرے لے کر اندر آگیا۔ اس نے ساری چیزیں تپائی پر سجا دیں اور واپس چلا گیا۔

"بسم اللہ کریں ملک جی!" چوہدری نے کہا۔

ہم کھانے پینے لگے اور اس کے ساتھ ہی ہماری گفتگو کا موضوع بھی بدل گیا تھا۔

* * *

ملک عبدالرحمٰن میرے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی پریشانی کے تاثرات ضرور تھے لیکن اکڑفوں جوں کی توں تھی۔ اس کی گردن بھی پگڑی کے شملے کی طرح تنی ہوئی تھی۔ یہ شاید اس کی زندگی کا پہلا موقع تھا کہ پولیس والے اسے گاؤں سے پکڑ کر اس طرح تھانے لے آئے تھے۔ کل اس نے جس طرح میرے سامنے بات کی تھی اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ پولیس کے مجھ جیسے معمولی افسروں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ ممکن

ہے میرے اندازے غلط ہوں لیکن دو تین باتوں نے مجھے اس کی طرف سے مشکوک کر دیا تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ چوہدری مرید احمد کے قتل سے چار پانچ روز پہلے اس کا چوہدری مرید سے جھگڑا ہوا تھا اور اس نے چوہدری مرید احمد پر پستول تان لیا تھا جس کے کئی گواہ موجود تھے۔ دوسری بات یہ کہ اس نے جھوٹ بولا تھا کہ چوہدری مرید احمد کے قتل والی رات وہ لکھوڈیر میں چوہدری حشمت کا مہمان تھا اور وہ صبح نو بجے کے بعد وہاں سے نکلا تھا۔ تیسری اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ چوہدری حشمت سے جو زمین خریدنا چاہتا تھا اس کا گاہک چوہدری مرید احمد بھی تھا اور غالباً اگر وہ قتل نہ ہو جاتا تو زمین کا سودا اسی سے ہو جاتا۔ اس کے علاوہ میں جب چوہدری حشمت کی بیٹھک میں بیٹھا ہوا تھا تو ملک عبدالرحمٰن کا آدمی اس کا کوئی پیغام لے کر چوہدری حشمت کے پاس آیا تھا اور اتفاق سے میں نے اس آدمی کو دیکھ لیا تھا۔ چوہدری حشمت نے اگرچہ بات کو ٹال دیا تھا لیکن مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ ملک عبدالرحمٰن نے اسے یہی پیغام بھیجا ہو گا کہ اگر پولیس اس کے بارے میں دریافت کرے تو وہ یہی بتائے کہ اس رات ملک عبدالرحمٰن اس کے گھر میں تھا لیکن اس کے پیغام رساں کو وہاں پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی اور چوہدری حشمت اس سے پہلے ہی مجھے بتا چکا تھا کہ ملک عبدالرحمٰن رات آٹھ بجے کھانا کھا کر چلا گیا تھا۔ ملک عبدالرحمٰن نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ چوہدری حشمت سے ملنے کے لیے جانے والا ہے لیکن نجانے کس مصلحت کی بنا پر اس نے خود جانے کے بجائے اپنا آدمی بھیج دیا تھا اور اسے وہاں پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی۔

ان ساری باتوں نے ملک عبدالرحمٰن کو مشکوک بنا دیا تھا اسی لیے میں نے آج صبح ہی ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں کو بھیج کر اسے تھانے بلوا لیا تھا۔ مجھ جیسے افسر کو خاطر میں نہ لانے والا معزز زمیں دار دو کانسٹیبلوں کے ساتھ تھانے آ گیا تھا کیوں کہ شاید وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے انکار کیا تو پولیس والے اسے زبردستی لے آئیں گے اور گاؤں میں اس کی بے عزتی ہو گی۔ اب وہ میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

"ملک عبدالرحمٰن!" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "تم تو مجھ جیسے افسروں پر دھونس جما رہے تھے۔ لیکن کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ دو معمولی کانسٹیبل تمہیں پکڑ لائے ہیں۔"

"مطلب کی بات کرو۔" ملک عبدالرحمٰن غرایا "مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟"

"یہ معلوم کرنے کے لیے کہ قتل کی رات تم کہاں تھے؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"میں بتا چکا ہوں کہ اس رات میں لکھوڈیر میں چوہدری حشمت کے گھر تھا۔ تم چاہو تو اس سے میرے بیان کی تصدیق کر سکتے ہو۔" اس نے بدستور تند لہجے میں جواب دیا۔

"تصدیق کر چکا ہوں اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تمہارا آدمی پیغام لے کر بہت دیر سے پہنچا تھا اور میں اس سے پہلے ہی یہ معلوم کر چکا تھا کہ تم اس رات آٹھ بجے وہاں سے چلے گئے تھے۔"

یہ سنتے ہی ملک عبدالرحمٰن کا چہرہ دھواں ہو گیا۔

"دیکھو ملک عبدالرحمٰن!" میں نے کہا "کئی باتیں تمہارے خلاف جا رہی ہیں۔ مثلاً کتوں کی لڑائی والی رات تمہارا چوہدری مرید احمد سے جھگڑا۔ تم دونوں چوہدری حشمت کی زمین خریدنا چاہتے تھے اور چوہدری مرید احمد نے اس زمین کی تم سے زیادہ قیمت لگائی تھی اور تیسری بات قتل والی رات اپنے گھر سے تمہاری عدم موجودگی۔ اگر ذرا گہرائی میں تفتیش شروع ہوئی تو اور بھی بہت سی باتیں سامنے آ سکتی ہیں اور یہ سب چیزیں مل کر تمہیں پھانسی کے تختے پر پہنچا دیں گی۔ بہتر یہی ہے کہ جو کچھ بھی ہے، سچ سچ بتا دو۔ ہو سکتا ہے اس میں تمہاری بھلائی کا کوئی پہلو نکل آئے۔"

ملک عبدالرحمٰن نظریں جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔

"کیا تمہاری خاموشی کو اقبالِ جرم سمجھا جائے ملک عبدالرحمٰن!" میں نے کہا۔

"نہیں ملک جی!" وہ مدھم لہجے میں بولا "چوہدری مرید احمد سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اس کے قتل میں میرا ہاتھ نہیں ہے۔"

"اگر تم یہ ثابت کر دو کہ اس رات کہاں تھے تو بچ سکتے ہو۔ بصورتِ دیگر تمہارے خلاف تین سو دو کا پرچہ کٹ جائے گا۔" میں نے کہا۔

"آپ کو ثبوت چاہیے نا ملک صاحب کہ میں اس رات کہاں تھا اور میں نے آپ سے جھوٹ کیوں بولا تھا؟" ملک عبدالرحمٰن بولا۔

"ہاں۔ اگر قانون کو جائے واردات سے تمہاری عدم موجودگی کا ثبوت مل جائے تو میری تمہارے ساتھ کوئی دشمنی تو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"بات یہ ہے ملک جی......" اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ وہ بات کرتے ہوئے جھجک رہا تھا۔

"ہاں...... ہاں کہو کیا بات ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"ملک صاحب! بات یہ ہے کہ ایک مہینے پہلے میں نے اپنی بیوی سے چوری چھپے دوسری شادی کر لی تھی۔ میری اس دوسری شادی کا میرے خاندان یا میرے گاؤں والوں میں سے کسی کو بھی علم نہیں ہے۔ میں ہفتے میں ایک دن اپنی پہلی بیوی سے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اپنے گھر سے غائب رہتا ہوں اور میری وہ رات دوسری بیوی کے ساتھ گزرتی ہے۔ اس رات بھی میں وہیں تھا۔" ملک عبدالرحمٰن نے کہا۔

"تمہاری دوسری بیوی کہاں رہتی ہے؟" میں نے پوچھا۔ اس کے اس انکشاف پر مجھے کسی قدر حیرت بھی ہوئی تھی۔

"لکھن پور میں۔" ملک عبدالرحمٰن نے جواب دیا "میں اپنے

سوہرے کا نام بتا رہا ہوں۔ آپ چاہیں تو اس وقت کسی کو وہاں بھیج کر میرے بیان کی تصدیق کر سکتے ہیں۔"

"وہ تو میں کرلوں گا لیکن تم نے اپنے خاندان کے کسی فرد کو تو بتایا ہوگا۔ کسی کو تو اعتماد میں لیا ہوگا جو مشکل کے وقت تمہارے کام آسکے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جی! بات ہی ایسی تھی کہ میں کسی کو نہیں بتا سکا تھا۔" ملک عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔

"آخر ایسی کیا مجبوری تھی؟" میں نے اسے گھورا۔

"بات یہ ہے ملک جی کہ میری دوسری بیوی کا تعلق جولاہوں کے خاندان سے ہے اور ہم ٹھہرے گکے زئی ملک۔ میں جانتا ہوں کہ جب بھی میرے خاندان والوں کو اس شادی کا پتا چلے گا' ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔" ملک عبدالرحمٰن چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "مجبوری یہ تھی کہ چند مہینے پہلے میں نے روشن کو دیکھا تو میرا دل گھائل ہوگیا۔ لکھن پور میں بھی میری تھوڑی سی زمین ہے۔ اس روز میں اس طرف گیا تو وہ میرے ایک کھیت سے ساگ توڑ رہی تھی۔ اس کے بعد میں اکثر وہاں جانے لگا۔ روشن میرے قریب آگئی اور پھر وہ ہوگیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ دو مہینے پہلے یہ خوف ناک انکشاف ہوا کہ روشن میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اس کے ماں باپ کو بھی پتا چل گیا تھا۔ وہ مجھے مجبور کرنے لگے کہ میں روشن سے شادی کرلوں۔ انہوں نے اپنے ایک دور کے رشتے دار کو بھی بلالیا تھا جو لاہور ضلع کچہری میں وکیل ہے۔ اگر میں شادی سے انکار کرتا تو وہ مجھے بدنام کردیتے اور میری عزت خاک میں مل جاتی۔ مجھے شادی کے لیے ہاں کرنی پڑی۔ اس وکیل نے پکا کام کیا تھا۔ اس نے لکھن پور والی زمین روشن کے نام لکھوائی اور اشامپ پیپر پر اور بھی بہت سی شرطیں لکھوائی تھیں۔ اب اگر میں روشن کو چھوڑتا ہوں تو مجھے نہ صرف لکھن پور والی زمین سے دست بردار ہونا پڑے گا بلکہ اور بھی بہت سا مالی نقصان اٹھانا پڑے گا۔ میں تو عجیب مصیبت میں پھنس گیا ہوں ملک جی! اب سوچتا ہوں کہ بزرگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ دو کشتیوں میں پیر رکھنے والا نقصان اٹھاتا ہے۔"

میں گہری نظروں سے ملک عبدالرحمٰن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی ساری اکڑفوں ختم ہوگئی تھی اور مجھے یہ بھی یقین تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا لیکن اپنی تسلی اور اس کے بیان کی تصدیق کے لیے میں نے سادہ لباس میں ایک آدمی لکھن پور بھیج دیا۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک بوڑھا بھی تھا اور وہ بوڑھا ملک عبدالرحمٰن کا سسر رحیو جولاہا تھا۔

میں نے ملک عبدالرحمٰن کو جانے کی اجازت دے دی اور یہ وعدہ بھی کرلیا کہ اس کا یہ راز کسی کو نہیں بتاؤں گا لیکن میں جانتا تھا کہ یہ بات زیادہ دنوں تک چھپی نہیں رہ سکے گی اور اسے ایک دن رسوائی کا سامنا ضرور کرنا پڑے گا۔ بہرحال' یہ میرا نہیں اس کا دردِ سر تھا۔ میری طرف سے وہ کلیئر ہوچکا تھا۔

میں نے ابھی تک چوہدری مرید احمد کی بیوہ یا بیٹے شبیر احمد سے ملاقات نہیں کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ صدمے سے دوچار ہیں۔ چوہدری مرید کے قل ہوجائیں تو ان دونوں سے بات کروں گا۔

چوہدری مرید احمد کے قل ہوچکے تو میں نے وہاں جانے کا فیصلہ کرلیا۔ حسبِ معمول اے ایس آئی حامد علی میرے ہمراہ تھا۔

ہم گاؤں سے ابھی دور ہی تھے کہ ہمیں منشی سلامت علی مل گیا۔ وہ کھیتوں کی طرف جارہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ رک گیا۔

"بسم اللہ ملک جی! کیسے آنا ہوا؟" اس نے سلام کرتے ہوئے پوچھا۔

"تم شاید بھول گئے ہو کہ تین دن پہلے تمہارا مالک قتل ہوچکا ہے۔" میں نے کہا۔

"چنگی طرح یاد ہے جی! کل تو چوہدری صاحب کے قل بھی ہوگئے۔ بڑے لوگ آئے ہوئے تھے جی۔ لوگ کیوں نہ آتے جی۔ چوہدری صاحب بندے ہی بڑے نیک تھے۔" منشی نے کہا۔

"قل تو ہوگئے مگر قتل کے کیس کی تفتیش ابھی باقی ہے۔" میں نے گھوڑی سے اترتے ہوئے کہا۔ اس وقت ہم کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی پر ایک ٹاہلی کے سائے میں کھڑے تھے۔ میں نے گھوڑی کو چھوڑ دیا۔ وہ کھیت میں چرنے لگی۔ اے ایس آئی حامد علی بھی گھوڑے سے اتر آیا تھا۔

"ہاں جی ـــ یہ بات تو میں بھول ہی گیا تھا کہ ابھی تشویش باقی ہے۔" منشی سلامت علی نے تفتیش کی ریڑھ لگادی "ویسے کچھ پتا چلا جی! کون ہے وہ ظالم جس نے چوہدری صاحب کو قتل کیا تھا؟"

"یہی تو معلوم کرنا ہے۔ میں اس سلسلے میں کچھ باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ضرور پوچھیں جی!" منشی سلامت علی نے کہا۔

"چوہدری مرید احمد کی کسی سے دشمنی تھی۔ کسی کے ساتھ کوئی مقدمہ وغیرہ چل رہا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہ جی! کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی اور مقدمے بازی بھی کسی سے نہیں تھی۔" منشی سلامت علی نے جواب دیا۔

"چوہدری صاحب کے کمرے کی تجوری کھلی ہوئی تھی۔ اس میں چند کاغذات اور ایک انگوٹھی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ تجوری میں رقم بھی ہوگی اور زیورات بھی۔ تمہارے خیال میں کتنی رقم ہوگی اور زیورات کی مالیت کیا ہوگی؟"

"زیورات کا تو مجھے پتا نہیں جی لیکن قتل سے چھ سات دن پہلے چھوٹے چوہدری صاحب شہر کے ایک بیوپاری سے پچاس ہزار روپے لے کر آئے تھے جو بڑے چوہدری نے تجوری میں رکھ دیے تھے۔"

"اس رقم کے بارے میں کون کون جانتا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"حویلی کے سارے ہی لوگوں کو پتا تھا جی!" منشی نے جواب دیا۔ "چوہدری صاحب نے حویلی کے نوکروں سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔"

"حویلی کے نوکروں کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سب ایمان دار ہیں جی! کبھی ایک دھیلے کی ہیرا پھیری نہیں کی۔" منشی نے کہا۔

"کسی کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔" میں نے کہا "مجھے حویلی کے نوکروں کے نام بتاؤ اور ان لوگوں کے بھی جن کا حویلی میں آزادانہ آنا جانا ہو۔"

منشی سلامت علی نے نام بتا دیے جنہیں میں نے ڈائری میں نوٹ کر لیا۔

"چوہدری کا بیٹا شبیر احمد کیسا آدمی ہے۔ کیا باپ بیٹوں کا کبھی روپے پیسے یا کسی اور معاملے میں کوئی جھگڑا ہوا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"کبھی نہیں جی!" منشی سلامت علی نے جواب دیا "شبیر احمد اگرچہ چوہدری صاحب کا سوتیلا بیٹا ہے۔ پر کبھی انہوں نے بیٹے کو سوتیلے پن کا احساس نہیں ہونے دیا۔"

سوتیلے کا نام سن کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ مجھے ابھی تک کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ شبیر احمد، چوہدری مرید احمد کا سوتیلا بیٹا ہے۔

"اوہ!" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم جانتے ہو جہاں یہ سوتیلے رشتے آجاتے ہیں وہاں جائداد کے مسئلے ضرور سر اٹھاتے ہیں۔"

"نہیں ملک جی!" منشی سلامت علی نے کہا "بڑے چوہدری صاحب نے اسے کبھی سوتیلا نہیں سمجھا۔ سارا حساب کتاب اور شہر کے بیوپاریوں سے لین دین، سب کچھ چھوٹے چوہدری کے ہاتھ میں ہے۔ بڑے چوہدری صاحب نے اس سے کبھی حساب نہیں مانگا۔"

"جانتے ہو شبیر احمد کیسا آدمی ہے؟ میرا مطلب ہے اسے عورتوں اور شراب سے دلچسپی ہے یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے بارے میں کبھی کوئی ایسی بات سنی نہیں تھی۔ ویسے آپ جانتے ہیں، جوان آدمی ہے۔ کوئی الٹی سیدھی حرکت کر بھی سکتا ہے۔" منشی نے جواب دیا۔

میں نے اسے جھگیاں والی زینو اور شہر کے دوستوں کے ساتھ شراب نوشی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ میرے ساتھ حویلی چلو۔ میں ذرا اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"چھوٹے چوہدری صاحب تو آج سویرے ہی شہر چلے گئے ہیں جی! منڈی میں بیوپاری سے کوئی حساب کرنا تھا۔ وہ کل واپس آئیں گے۔" منشی نے کہا۔

"چوہدرانی تو ہوگی نا حویلی میں۔ مجھے اس سے بھی ملنا ہے۔" میں نے کہا۔

منشی سلامت علی نے کھیت میں چرتی ہوئی میری گھوڑی کی لگام پکڑی اور ہم پیدل ہی گاؤں کی طرف چلنے لگے جو وہاں سے نصف میل سے زیادہ دور نہیں تھا۔

حویلی میں بہت سے مہمان اب بھی موجود تھے۔ گزشتہ روز چوہدری مرید احمد کے قل تھے۔ قرب و جوار سے جو لوگ آئے تھے، وہ تو واپس چلے گئے تھے۔ جو لوگ شہر یا دور دراز علاقوں سے آئے تھے وہ اب بھی حویلی ہی میں تھے۔ حویلی میں ٹھہرے ہوئے ان مہمانوں میں چوہدرانی کے میکے والے بھی تھے۔

منشی سلامت علی نے مجھے بیٹھک میں لے جا کر بٹھا دیا اور خود باہر نکل گیا۔ میرے ساتھ حامد علی بھی تھا۔ بیٹھک میں آتش دان کے کارنس پر سیاہ لکڑی کے فریم میں چوہدری مرید احمد کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ یہ اس کی جوانی کی تصویر تھی جسے دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ جوانی میں وہ بڑا وجیہہ و شکیل رہا ہوگا۔

چند منٹ بعد منشی سلامت علی دوبارہ بیٹھک میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی جس نے سیاہ چادر اس طرح اوڑھ رکھی تھی کہ اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔ وہ مجھ سے چند فٹ دور ایک رنگین پیڑھے پر بیٹھ گئی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ چادر میں چھپے ہوئے تھے لیکن اس کے پیر نظر آرہے تھے۔ پیر پتلے اور لمبے تھے اور رنگت بھی بڑی گوری تھی۔ میں نے مناسب الفاظ میں اس کے شوہر کے انتقال پر تعزیت کی اور اس کے فوراً ہی بعد اصل بات پر آگیا۔

"چوہدرانی جی!" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "جس رات یہ سانحہ رونما ہوا اس رات آپ تو یہاں نہیں تھیں لیکن کیا آپ کو کسی پر شبہ ہے؟"

"نہیں جی۔ مجھے کسی پر شبہ نہیں ہے۔" چوہدرانی نے جواب دیا۔ اس کی آواز سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس کی عمر بھی زیادہ نہیں ہے "ان کی تو کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ وہ تو بہت اچھے انسان تھے جی!"

"جب تک کسی پر شبہ نہ ہو، ہم تفتیش نہیں کر سکتے۔ کوئی ایسا شخص جس سے گھر میں ان کا کوئی جھگڑا ہوا ہو۔ روپے پیسے کے لین دین یا جائداد کے معاملے میں کوئی تنازع ـــ کوئی چھوٹی سی بات جو آپ کے ذہن میں کھٹکتی ہو۔" میں نے کہا۔

"ان کا کسی سے کوئی جھگڑا کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ تو بہت ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے۔ اگر کوئی کچھ کہتا بھی تو خاموشی سے سن لیتے لیکن ہاں..... میں نے سنا تھا کہ چند روز پہلے کتوں کی لڑائی پر ان کا بھینی کے کسی زمیں دار سے جھگڑا ہو گیا تھا اور اس زمیں دار نے ان پر پستول نکال لیا تھا۔" چوہدرانی نے کہا۔

"یہ بات آپ کو چوہدری صاحب نے خود بتائی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جی! وہ باہر کی کوئی بات گھر میں نہیں بتاتے تھے۔" چوہدرانی نے جواب دیا "یہ بات تو مجھے حویلی کے نوکروں نے بتائی تھی جو اس رات ان کے ساتھ گئے ہوئے تھے۔"

"آپ کو شاید بتا دیا گیا ہو کہ چوہدری صاحب کے کمرے کی تجوری سے سب کچھ غائب ہے۔ کیا آپ تجوری میں رکھی جانے والی رقم یا زیورات کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہیں؟"

"میں اپنے ساتھ صرف دو کانٹے' دو مندریاں اور چار چوڑیاں لے کر گئی تھی۔ باقی سارے زیور ان کی تجوری ہی میں تھے۔ چند روز پہلے شبیر احمد نے انہیں شہر کے کسی بیوپاری سے پچاس ہزار روپے لا کر دیے تھے۔ وہ بھی تجوری ہی میں تھے۔"

"چوہدری صاحب کے قتل سے ایک روز پہلے آپ کسی پروگرام کے بغیر میکے چلی گئی تھیں یا پہلے سے کوئی پروگرام تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے ایک دن پہلے میکے جانے کا پروگرام بنایا تھا جی اور چوہدری صاحب کو معلوم تھا۔" چوہدرانی نے یہ کہتے ہوئے پیڑھے پر پہلو بدلا۔ ایسا کرتے ہوئے چادر اس کے سر سے ڈھلک گئی اور اس کے ساتھ ہی میں چونک گیا۔

چوہدرانی کے پیر دیکھ کر اور آواز سن کر میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ عمر میں چوہدری مرید احمد سے کئی سال چھوٹی ہو گی لیکن اب جو اس کے سر سے چادر ڈھلکی اور اس کا چہرہ میرے سامنے آیا تو میں انگشت بدنداں رہ گیا تھا۔ اس کی عمر تیئیس چوبیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ گورا چٹا رنگ اور بے حد حسین تھی وہ..... جبکہ چوہدری مرید احمد کی عمر موت کے وقت پینتالیس اور پچاس کے درمیان تھی۔ میرے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ عورت ایک جوان بیٹے کی ماں کس طرح ہو سکتی تھی۔ میں نے چوہدری کے سوتیلے بیٹے شبیر احمد کو ابھی تک دیکھا تو نہیں تھا لیکن لوگوں سے اس کے بارے میں جو سنا تھا اس حساب سے اس کی عمر چھبیس ستائیس سال سے کم نہیں ہونی چاہیے تھی۔ اس طرح تو میرے سامنے بیٹھی ہوئی یہ عورت اپنے بیٹے سے بھی دو تین سال چھوٹی لگتی تھی۔

چوہدرانی کا نام رابعہ تھا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے جلدی سے چادر درست کر لی۔ اس مرتبہ اس نے چادر کو اس طرح اوڑھا تھا کہ چہرے کا کچھ حصہ صاف نظر آ رہا تھا جسے اس نے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"چوہدری صاحب سے آپ کی شادی کب ہوئی تھی؟" میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"دو سال ہو گئے ہیں جی!" چوہدرانی نے جواب دیا۔

"بچے کتنے ہیں؟" میرا اگلا سوال تھا۔

"کوئی نہیں جی۔ رب نے مجھے اس نعمت سے محروم ہی رکھا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"اور یہ شبیر احمد! سنا ہے یہ چوہدری صاحب کا سوتیلا بیٹا ہے لیکن آپ کی عمر تو....." میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "اور آپ کی تو کوئی اولاد بھی نہیں ہے۔"

"شبیر احمد میرا بیٹا نہیں ہے جی!" چوہدرانی نے جواب دیا۔

اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا تھا۔

"بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" میں الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں آپ کو بتاتا ہوں ملک جی!" اس موقع پر سلامت علی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ وہ مزید کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ چوہدرانی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں جاؤں جی!" اس نے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر اندرونی دروازے کا پردہ اٹھا کر اندر چلی گئی۔

"ہاں بھئی منشی سلامت علی۔ اب بتاؤ یہ سب کیا ہے؟" میں منشی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"بات یہ ہے ملک جی!" منشی سلامت علی سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولا "آج سے چودہ سال پہلے چوہدری مرید احمد نے بشریٰ نام کی ایک بیوہ عورت سے شادی کی تھی۔ اس کا پہلے شوہر سے بارہ سال کا ایک بیٹا بھی تھا شبیر احمد۔ یہ شادی شیخوپورہ کے ایک گاؤں میں بڑی سادگی سے ہوئی تھی۔ برات میں صرف آٹھ دس آدمی تھے جن میں مَیں بھی شامل تھا۔

"بشریٰ بی بی اپنے شوہر کے لیے بڑی اچھی بیوی اور ہمارے لیے بڑی اچھی مالکن ثابت ہوئیں۔ چوہدری صاحب ایک ٹانگ سے معذور تھے۔ انہیں کہیں آنے جانے میں دشواری ہوتی تھی۔ بشریٰ بی بی نے نہ صرف گھر سنبھال لیا بلکہ زمینوں کی دیکھ بھال بھی اپنے ذمے لے لی۔ وہ شوہر کا بھی ہر طرح سے خیال رکھتی تھیں۔

"شبیر احمد اس وقت پانچویں میں پڑھتا تھا۔ اسے پڑھنے کا شوق تھا۔ وہ چوہدری صاحب کی بھی بڑی خدمت کرتا تھا۔ شاید اسے اپنی یتیمی کا احساس تھا لیکن چوہدری صاحب کو اس نے باپ کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ چوہدری صاحب بھی اسے بہت چاہتے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس کی پڑھائی کا شوق دیکھ کر ہی چوہدری صاحب نے محکمۂ تعلیم سے اپنے گاؤں میں مڈل اسکول قائم کرنے کی منظوری لے لی تھی۔ اسکول کے تمام اخراجات وہ خود اٹھا رہے تھے۔

"بشریٰ بی بی سے چوہدری صاحب کی اپنی اولاد نہیں ہو سکی۔ وہ شبیر احمد کو اپنے سگے بیٹے کی طرح چاہتے تھے۔ مڈل اسکول پاس کرنے کے بعد شبیر احمد کو لاہور کے گورنمنٹ اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ میٹرک کرنے کے بعد شبیر احمد گاؤں واپس آ گیا۔ تعلیم سے اس کا دل اچانک ہی اچاٹ ہو گیا تھا حالاں کہ چوہدری صاحب چاہتے تھے کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی۔

"گاؤں واپس آ کر شبیر احمد نے زمینوں کا انتظام سنبھال لیا۔ وہ بڑا ذہین لڑکا ہے۔ اس نے بڑی جلدی سب کچھ سمجھ لیا اور پھر کچھ عرصے بعد چوہدری صاحب نے سارا حساب کتاب اس کے حوالے کر دیا۔ میں تو صرف نام کا منشی رہ گیا تھا لیکن سارا حساب مجھے بھی معلوم تھا۔ شبیر احمد نے کبھی ایک دھیلے کی گڑبڑ نہیں کی۔

"تین سال پہلے بشریٰ بی بی کا انتقال ہو گیا۔ چوہدری صاحب اداس اور بیمار رہنے لگے۔ انہیں دیکھ بھال اور غم گساری کے لیے کسی عورت کی ضرورت تھی۔ لوگوں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ دوسری شادی کر لیں لیکن وہ انکار کرتے رہے۔

"تقریباً دو سال پہلے وہ اپنے ایک دوست سے ملنے کے لیے لوناریاں چلے گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس گاؤں میں چوہدری صاحب نے رابعہ بی بی کو دیکھ لیا۔ رابعہ بی بی انہیں پسند آگئی۔ انہوں نے میرے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے ان کے دوست سے بات چھیڑ دی۔

"رابعہ غریب والدین کی بیٹی تھی۔ ان کی کوئی زمین نہیں تھی۔ باپ کی اسی گاؤں میں کریانے کی دکان تھی۔ چوہدری صاحب کے دوست نے ان سے رشتے کی بات کی۔ پہلے تو وہ ہچکچائے کہ چوہدری صاحب ایک ٹانگ سے معذور ہیں لیکن پھر انہیں سمجھایا گیا کہ ان کی بیٹی راج کرے گی تو وہ مان گئے اور اس طرح رابعہ بی بی سے چوہدری صاحب کی شادی ہو گئی۔"

"کیا شبیر احمد نے اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جی...... وہ تو بہت خوش تھا۔" منشی سلامت علی نے کہا۔ "عمر میں وہ اگرچہ رابعہ بی بی سے دو تین سال بڑا ہی ہے لیکن بڑے ادب سے بات کرتا ہے ان سے۔"

"کیا رابعہ بی بی کے ماں باپ کو پتا تھا کہ چوہدری کا ایک بیٹا بھی ہے جو عمر میں رابعہ سے بڑا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پتا تھا جی! انہیں سب کچھ بتا دیا گیا تھا۔" منشی سلامت علی نے جواب دیا "لیکن انہیں شبیر احمد کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اگر کوئی چھوٹا بچہ ہوتا تو شاید وہ کچھ سوچتے۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "شبیر احمد شہر سے کب واپس آئے گا۔"

"کل آجائے گا جی!" منشی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں کل شام کو کسی وقت چکر لگاؤں گا۔" میں یہ کہتے ہوئے بیٹھک سے باہر آگیا اور حویلی میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا "حویلی کے جن نوکروں اور دوسرے آدمیوں کے نام تم نے لکھوائے ہیں ان سے کہنا کہ کل صبح تھانے آجائیں۔ میں ان سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"بہت اچھا جی!" منشی نے کہا۔

گاؤں سے واپس جاتے ہوئے میں اس نئی صورتِ حال کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ صورتِ حال واقعی دلچسپ اور عجیب تھی۔ چوہدری مرید احمد نے جس بیوہ عورت سے شادی کی تھی اس کا پہلے شوہر سے ایک بیٹا تھا۔ چوہدری کی بیوی بشریٰ بی بی کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بیٹے شبیر احمد سے چوہدری مرید احمد کا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ اس طرح بشریٰ بی بی کی موت کے بعد ان کا ناتا ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن مرید احمد نے اسے اپنے بیٹے کی طرح گھر میں رکھا اور اب وہ چھبیس سال کا جوان تھا جب کہ چوہدری مرید احمد نے چوبیس سالہ ایک خوب صورت لڑکی سے شادی کر لی تھی۔

رابعہ بی بی غریب گھر کی بیٹی تھی۔ اس کے ماں باپ نے دولت کے لالچ میں بیٹی کی شادی ایک ٹانگ سے معذور اور عمر میں باپ جتنے بڑے آدمی سے شادی کر دی تھی۔ دو سال گزرنے کے بعد بھی وہ اولاد سے محروم رہے تھے۔ اس میں قصور دونوں میں سے کس کا تھا؟ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا لیکن یہ عجیب ستم ظریفی تھی کہ اولاد سے محروم ہونے کے باوجود رابعہ بی بی اپنی عمر سے دو سال بڑے لڑکے کی ماں تھی۔

حویلی کے نوکروں اور گاؤں والوں کے بیانات کے مطابق چوہدری مرید احمد اور رابعہ بی بی' دونوں اس شادی سے خوش تھے۔ ان میں کبھی کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ شبیر احمد نے بھی کبھی چوہدری مرید احمد کی اس دوسری شادی پر اعتراض نہیں کیا تھا اور رابعہ نے بھی گھر میں جوان لڑکے کی موجودگی پر اعتراض کا کوئی نکتہ نہیں اٹھایا تھا۔ اس نے شبیر کو بیٹے اور شبیر احمد نے اسے ماں کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا اور ان دونوں کے تعلقات بھی بڑے خوش گوار تھے۔ ان میں کبھی کسی بات پر ناچاقی نہیں ہوئی تھی۔

شبیر احمد نے اپنے گاؤں میں اپنے اوپر شرافت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا لیکن گاؤں سے باہر وہ کیا گل کھلاتا تھا؟ اس کا راز میرے سامنے دُلے کمہار نے فاش کر دیا تھا۔

ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ میری شبیر احمد سے اب تک ملاقات نہیں ہو سکی تھی لیکن تازہ ترین صورتِ حال سے واقف ہونے کے بعد میں نے اس کی غیر حاضری میں اس کے بارے میں تحقیقات کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اے ایس آئی حامد کو تھانے واپس بھیج دیا اور گامے موچی کو تلاش کرتا ہوا گاؤں کے چوک پر پہنچ گیا۔

چوک کے عین وسط میں برگد کا ایک بہت بڑا درخت تھا جس کے چاروں طرف تقریباً دس فٹ چوڑا چبوترا بنا ہوا تھا۔ یہ چبوترا زمین سے تقریباً تین فٹ اونچا تھا اور اس پر مختلف لوگوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ ایک طرف نائی نے کرسی جما رکھی تھی۔ ٹوٹا ہوا آئینہ اور میلا سا تولیا درخت کے تنے پر ٹھکی ہوئی کیلوں میں ٹنگے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی چمڑے کا وہ ٹکڑا بھی ٹنگا ہوا تھا جس پر نائی استرے کی دھار لگاتا تھا۔ درخت کے تنے کے قریب چبوترے پر ٹین کا ایک چھوٹا سا صندوقچہ کھلا پڑا تھا۔ اس کے اندر دو تین استرے' دو قینچیاں اور دو کنگھے سجے ہوئے تھے۔ کنگھے بہت میلے تھے اور ان کے بہت سے دندانے ٹوٹے ہوئے تھے۔

دوسری طرف گامے موچی نے قبضہ جما رکھا تھا۔ اس کے دائیں طرف لکڑی کا ایک صندوق رکھا ہوا تھا جس میں چمڑے' ٹائر کے ٹکڑے اور چند پرانے جوتے بھرے ہوئے تھے۔ اس صندوق کا ایک حصہ ٹرے کی طرح تھا جس میں لکڑی کی پٹیوں سے چھوٹے چھوٹے خانے بنے ہوئے تھے۔ ان خانوں میں مختلف سائز کی کیلیں

اور جوتوں کے سول میں لگانے والے اسٹلا بھرے ہوئے تھے۔ صندوق کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا جس کے اندر کی طرف چمڑے کی ایک پٹی لگی ہوئی تھی اور اس میں جوتوں کی مرمت میں استعمال ہونے والے اوزار سجے ہوئے تھے۔ درخت کے تنے پر ربر اور چمڑے کے سول اور مختلف رنگوں کے چمڑے کے ٹکڑے سجے ہوئے تھے۔ گاما موچی ایک چھوٹی سی چٹائی پر بیٹھا ہوا اس وقت بڑے انہماک سے ایک جوتے کی سلائی کر رہا تھا۔

ایک طرف پکوڑے والا چھابڑی لگائے بیٹھا تھا۔ پکوڑے دیکھنے ہی میں خاصے باسی لگ رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی دو تین اور چھابڑی والے تھے۔ گلے سڑے پھل اور ایسی ہی چیزیں تھیں جن پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ چند بچے برگد کی جٹاؤں سے لٹکے جھولا جھول رہے تھے۔

چوک کے ایک طرف چوپال تھی جہاں شام کے وقت گاؤں کے لوگ جمع ہو کر دن بھر کے حالات پر تبصرے اور خوش گپیاں کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی کریانے کی ایک دکان تھی۔ کریانے کی ایک دکان چوک کے دوسری طرف بھی تھی۔

میں چبوترے پر چڑھ کر گامے موچی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے لہرا گئے لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا۔ اس نے کام چھوڑ دیا اور مجھے سلام کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ میں گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی عمر پچیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ وہ ایک صحت مند اور گبھرو جوان تھا "تمہارا نام گاما ہے؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"جی جناب! حکم کریں۔ بوٹ پالش کر دوں۔" اس نے کہا۔

"نہیں۔۔۔ ذرا میرے ساتھ آؤ۔ تم سے کچھ پوچھنا ہے۔" میں نے کہا۔

چبوترے پر بیٹھے ہوئے اور آس پاس کھڑے ہوئے لوگ ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں گامے موچی کو لے کر ایک گلی میں آ گیا۔

"میں جو کچھ پوچھوں گا' سچ سچ بتانا۔ جھوٹ بولا تو کھال اتار دوں گا۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"م۔۔۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا جی۔ آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔" وہ گھبرا گیا۔

"شبیر احمد سے تمہارا کیا تعلق ہے۔ سنا ہے بڑی یاری ہے اس سے تمہاری؟"

"وہ۔۔۔ وہ بات یہ ہے جی میں ہیر بڑی سُر میں گا لیتا ہوں۔ میری آواز بھی اچھی ہے۔ چھوٹے چوہدری صاحب کو ہیر سننے کا شوق ہے۔ وہ کبھی کبھی مجھے اپنی بیٹھک میں بلا لیتے ہیں۔" گامے موچی نے جواب دیا۔

"سنا ہے تم اسے شراب اور عورتیں بھی سپلائی کرتے ہو؟" میں نے اسے گھورا۔

"ن۔۔۔ نہیں جی۔" اس کا چہرہ دھواں ہو گیا "یہ جھوٹ ہے جی! میں نے تو کبھی شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگایا نہ ہی کسی عورت کو جانتا ہوں۔ بڑے چوہدری صاحب اس معاملے میں بڑے سخت تھے جی۔ گاؤں میں کسی کو شراب پینے کی ہمت نہیں تھی جی!"

"میں اس گاؤں کی بات نہیں کر رہا۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "شبیر احمد جب جھگیاں جاتا ہے تو تم اس کے ساتھ ہوتے ہو۔ وہاں اس کے شہری دوست بھی آتے ہیں۔ شراب بھی چلتی ہے اور زینو بھی۔۔۔"

"میں کسی زینو کو نہیں جانتا جی۔" اس کے چہرے پر خوف کے سائے لہرانے لگے۔

"پہلی دفعہ تو تم ہی اسے لے کر آئے تھے۔" میں نے ایک نفسیاتی حربہ استعمال کیا۔

"ن۔۔۔ نہیں جی۔۔۔" گاما موچی ہکلا کر رہ گیا۔

میں نے اچانک ہی اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ وہ لڑکھڑا گیا اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"سچ بتاؤ ورنہ تمہاری کھال ادھیڑ دوں گا۔" میں نے کہا اور گلی کے موڑ کی طرف دیکھنے لگا جہاں تین چار آدمی کھڑے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

"وہ۔۔۔ وہ جی۔۔۔ چھوٹے چوہدری صاحب نے مجھے کہا تھا کہ جا کر زینو کو لے آؤں۔ وہ اس سے پہلے ہی بات کر چکے تھے۔"

"اب ہوئی نا بات۔" میں نے کہا "اور بتاؤ کیا کیا حرکتیں ہوتی تھیں؟"

"چھوٹے چوہدری صاحب کو پتا چل گیا تو مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے جی!" وہ بری طرح خوف زدہ ہو رہا تھا۔

"اس وقت میں تیرے سامنے کھڑا ہوں یا چھوٹا چوہدری۔" میں نے اسے ایک اور تھپڑ رسید کر دیا "جلدی بتا۔"

"وہ۔۔۔ چھوٹے چوہدری صاحب جب بھی جھگیاں پنڈ جاتے تھے ان کے شہر کے دو تین دوست بھی آ جاتے تھے۔ وہ شہر سے شراب لاتے تھے اور چھوٹے چوہدری صاحب رات کو زینو کو بلا لیتے تھے۔ اس طرح ساری رات اندر رہتے تھے اور میں باہر برآمدے میں بیٹھا رہتا تھا۔"

"پنڈ والوں نے ان حرکتوں پر کبھی اعتراض نہیں کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ سب چھوٹے چوہدری سے ڈرتے ہیں جی! اس لیے انہوں نے کبھی بڑے چوہدری صاحب سے شکایت بھی نہیں کی تھی۔" گامے نے جواب دیا۔

"جس رات چوہدری مرید احمد قتل ہوا تھا' اس رات تم کہاں تھے؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے یہ سوال اچانک ہی کیا تھا۔

"پنڈ میں ہی تھا جی۔۔۔ اپنے گھر میں۔" گامے نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر ایک بار پھر خوف کے سائے لہرا گئے تھے "میرا ابا

بیمار تھا جی۔ میں شام کو حکیم جی سے دوا لے کر گیا تھا۔ اس کے بعد گھر سے نہیں نکلا تھا جی۔"

"جھوٹ بول رہے ہو تم!" میں نے اسے ایک اور تھپڑ مار دیا۔ "تم اپنے گھر میں نہیں تھے۔ اس روز صبح سویرے تمہیں جھگیاں میں دیکھا گیا تھا۔"

"بتاتا ہوں جی!" اس نے بلبلاتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ دیے "وہ جی مجھے چھوٹے چوہدری صاحب نے کہا تھا کہ میں صبح سویرے ان کے پاس پہنچ جاؤں اس لیے میں صبح دن چڑھنے سے پہلے ہی وہاں چلا گیا تھا۔"

"اس وقت تمہیں پتا چل گیا تھا کہ چوہدری مرید احمد قتل ہو چکا ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں جی!" اس نے نفی میں سرہلایا "میں جھگیاں سے چھوٹے چوہدری کے ساتھ چلا گیا تھا لیکن اس نے مجھے دا بروتمہ والا سے واپس بھیج دیا۔ میں جب گاؤں واپس پہنچا تو سارا پنڈ حویلی کے سامنے جمع تھا۔ اس وقت مجھے پتا چلا کہ کسی نے رات کو بڑے چوہدری صاحب کو قتل کر دیا ہے۔"

میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اسے چھوڑ دیا اور اسے تنبیہہ کر دی کہ وہ گاؤں سے باہر نہیں جائے گا۔ چوک پر پہنچ کر میں چوہدری کی حویلی کی طرف مڑ گیا۔ میری گھوڑی حویلی کے پھاٹک کے ساتھ نیم کے درخت کے نیچے بندھی ہوئی تھی۔ میں نے گھوڑی کھولی' اس پر سوار ہوا اور گاؤں سے باہر جانے والے راستے پر روانہ ہو گیا۔

○☆○

وہ پانچ آدمی تھے۔ ان میں کرمو اور رحمو تو حویلی کے نوکر تھے اور باقی تین باہر کے کام کرنے والے تھے۔ حویلی میں ان کی آمدورفت کثرت سے تھی اور کتے بھی ان سے مانوس تھے۔

کرمو سے میں پہلے ہی حویلی میں پوچھ گچھ کر چکا تھا۔ رحمو اور باقی تینوں آدمیوں سے ابھی تک کوئی بات نہیں کی گئی تھی۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ایک بات کا اندازہ میں نے ان کے چہروں ہی سے لگا لیا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی اس جرم میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ میرے اندازے بہت کم غلط نکلتے تھے لیکن بعض اوقات پوچھ گچھ کے دوران کوئی ایسی چھوٹی سی بات سامنے آجاتی تھی جس سے آگے بڑھنے میں مدد مل جاتی تھی۔

میں نے ان چاروں کو کانسٹیبلوں کے حوالے کر دیا اور وہ اپنے مخصوص طریقے سے ان سے پوچھ گچھ کرنے لگے۔ ان میں سے بعض کی چیخیں تھانے میں گونج رہی تھیں۔ اس وقت صبح کے دس بجے تھے اور مجھے چوری کے ایک کیس کی تفتیش کے لیے سلامت پورہ جانا تھا۔ ایس ایچ او انسپکٹر مشتاق اس وقت تھانے میں موجود نہیں تھا۔ وہ بھی گشت پر نکلا ہوا تھا۔ میں نے اے ایس آئی کو بتایا کہ میں تفتیش کے لیے سلامت پورہ جا رہا ہوں۔ میرے واپس آنے تک ان چاروں سے کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہو جانا چاہیے۔

سائیس نے گھوڑی تیار کر دی تھی۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آیا ہی تھا کہ تھانے کے گیٹ کے سامنے ایک خوب صورت یکہ آکر رکا۔ یکے پر سیٹیں بڑے سلیقے سے بنائی گئی تھیں اور ان پر سفید کپڑے کے غلاف چڑھے ہوئے تھے۔ میں نے برآمدے سے اترنے کے لیے نچلے تھڑے پر پیر رکھا ہی تھا کہ دو آدمی یکے سے اتر کر گیٹ کی طرف بڑھتے نظر آئے۔ ان میں سے ایک چوہدری مرید احمد کا منشی سلامت علی تھا اور دوسرا اونچا لمبا گبرو جوان تھا۔ اس نے ایک خوب صورت چادر اور سفید سلک کی قمیص۔ ... پہن رکھی تھی۔ پیروں میں تلے والے کھسے تھے۔ وہ بڑا خوب رو جوان تھا۔ بھاری مونچھوں نے اس کے چہرے کو بڑا بارعب بنا دیا تھا۔ میں اس شخص کو نہیں جانتا تھا لیکن منشی سلامت علی کو اس کے ساتھ دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ مقتول چوہدری مرید احمد کا سوتیلا بیٹا شبیر احمد تھا۔

میں اس وقت برآمدے سے نیچے آچکا تھا۔ اس شخص نے آگے آکر بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ منشی سلامت علی نے اس کا تعارف کرا دیا۔ وہ شبیر احمد ہی تھا۔ میں اسے لے کر اپنے کمرے میں آگیا۔ منشی سلامت علی بھی ہمارے ساتھ ہی تھا۔

"آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے ملک جی!" وہ بے تکلفی سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا "لیکن مجھے افسوس ہے کہ مصروفیت کے باعث آپ سے ملنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ صبح شہر سے واپس آیا تو آپ کا پیغام ملا۔ میں نے سوچا ملاقات ہو ہی جائے۔"

"جی ہاں۔" میں نے سرہلایا۔ میں گہری نظروں سے اس کی حرکات وسکنات کا جائزہ لے رہا تھا "آپ سے ملاقات بہت ضروری ہو گئی تھی۔" پھر میں نے منشی سلامت علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "منشی! تم ذرا باہر جا کر بیٹھو۔ ضرورت ہوئی تو تمہیں بلا لوں گا۔" منشی سلامت علی اٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں دوبارہ شبیر احمد کی طرف متوجہ ہو گیا "شبیر احمد صاحب! میں نے اگرچہ چوہدری صاحب کے قتل کی تفتیش شروع کر رکھی ہے لیکن بعض باتیں ایسی ہیں جن کی ابھی تک وضاحت نہیں ہو سکی اور اس کے لیے آپ سے ملاقات ضروری تھی۔"

"حکم کریں ملک جی!" شبیر احمد سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولا "میں آپ سے ہر طرح کا تعاون کرنے کو تیار ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میاں جی کا قاتل جلد سے جلد قانون کی گرفت میں آجائے۔"

اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ متحمل اور سلجھے ہوئے مزاج کا آدمی تھا اور اونچ نیچ کو سمجھتے ہوئے بات کرنا جانتا تھا۔

"سب سے پہلے تو آپ یہ بتائیں کہ چوہدری صاحب سے آپ کا رشتہ کیا تھا؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"میاں جی سے رشتہ؟" اس کے منہ سے بے اختیار کرا

سانس نکل گیا "سارا پنڈ جانتا ہے کہ میں ان کا سوتیلا بیٹا ہوں۔"

"میں اس کی وضاحت چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"بات یہ ہے ملک جی!" شبیر احمد نے جواب دیا "میں اس وقت بہت چھوٹا تھا جب میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان دنوں ہم شیخوپورہ کے ایک گاؤں میں رہائش پذیر تھے۔ ہمارے پاس زمین نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ماں جی نے پنڈ کے چوہدریوں کے گھروں کا کام کر کے اور کپڑے سی کر میری پرورش کی۔ میں اس وقت پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا جب ماں جی نے دوسری شادی کر لی۔ میں بھی ان کے ساتھ شیخوپورہ والا گاؤں چھوڑ کر سیدپور آ گیا۔ پہلے میں ذرا ذرا سہما سہما سا رہتا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ سوتیلی اولاد کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اس کے ساتھ بڑا ظالمانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ اسے کھانے کو نہیں دیا جاتا اور چوبیس گھنٹے کام لیا جاتا ہے لیکن میرے معاملے میں یہ سب کچھ غلط ثابت ہوا۔ چوہدری صاحب میرے لیے انسان کے روپ میں فرشتہ ثابت ہوئے۔ وہ مجھے سگی اولاد کی طرح چاہتے تھے۔ ان کا پیار پا کر میں نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ ان کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔" وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا اور پھر وہی سب کچھ بتانے لگا جو میں اس سے پہلے منشی سلامت علی سے سن چکا تھا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا "ماں جی کے انتقال کے بعد میاں جی نے دوسری شادی کر لی۔ اس طرح گھر میں ایک بار پھر رونق آ گئی۔"

"آپ کو چوہدری صاحب کی اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میں کیوں اعتراض کرتا جی!" شبیر احمد نے جواب دیا۔

"میری بات کا برا مت مانیے۔ اس حقیقت سے آپ بھی انکار نہیں کریں گے کہ چوہدری صاحب سے آپ کا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ آپ کی والدہ کے انتقال کے بعد سوتیلے پن کا رشتہ بھی کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے بعد تو اس گھر میں آپ کی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی تھی اور یہاں رہنے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔ کیا چوہدری صاحب نے اس سلسلے میں کبھی کوئی بات کی تھی؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے جی! میں ایک حقیقت پسند آدمی ہوں۔ سہانے خواب دیکھنے کے بجائے حقیقت کا سامنا کرنا پسند کرتا ہوں۔" شبیر احمد نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "میں جانتا تھا کہ ماں جی کے انتقال کے بعد اس حویلی میں میری کوئی حیثیت باقی نہیں رہی۔ ماں جی کے انتقال کے تقریباً چار مہینے بعد میں نے میاں جی سے بات کرتے ہوئے یہاں سے جانے کی اجازت چاہی تھی تو انہوں نے مجھے بری طرح ڈانٹ دیا تھا کہ میں آئندہ ایسی کوئی بات نہ کروں۔ وہ تو مجھے اپنی اولاد کی طرح سمجھتے تھے جی!"

"اور ان کی دوسری شادی کے بعد؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس کے بعد بھی ان کے رویّے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔" شبیر احمد نے جواب دیا۔

"اصولی اور قانونی طور پر رابعہ بی بی سے آپ کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں جی۔" شبیر احمد نے جواب دیا "وہ اگرچہ عمر میں مجھ سے دو سال چھوٹی ہے لیکن میں اس کی بڑی عزت کرتا ہوں جی!"

"اب ایک اور بات۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں "اپنی حیثیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آپ نے کبھی نہ کبھی تو یہ سوچا ہو گا کہ چوہدری صاحب کی جائداد میں سے آپ کو کچھ ملے گا یا نہیں؟"

"میں پہلے بھی وضاحت کر چکا ہوں کہ میں حقیقت پسند آدمی ہوں۔" شبیر احمد نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں نے کبھی کوئی توقع نہیں رکھی۔ میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ مجھے جائداد میں سے کچھ ملتا ہے یا نہیں۔"

"ویسے اب آپ کے خیال میں جائداد کسے ملنی چاہیے؟" میں نے پوچھا۔

"رابعہ بی بی، میاں جی کی جائز وارث ہے۔ جائداد کی حق دار وہی ہے۔ اس کے سوا اس جائداد کا اور کوئی دعوے دار نہیں ہو سکتا۔"

"اگر آپ کو کچھ نہ ملے تو کیا آپ کو افسوس نہیں ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل نہیں جی۔" شبیر احمد نے جواب دیا "بلکہ میں نے تو آج صبح ہی منشی سلامت علی سے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے تمام کھاتے درست کر لے۔ میرا خیال ہے کہ میں میاں جی کے چہلم کے بعد سارا حساب رابعہ بی بی کے سپرد کر کے یہاں سے رخصت ہو جاؤں گا۔"

"کیا آپ نے رابعہ بی بی کو یہ بتا دیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی نہیں جی!" اس نے نفی میں سر ہلایا "لیکن وقت آنے پر بتا دوں گا۔"

"رابعہ بی بی کی شادی کو تقریباً دو سال ہو چکے ہیں۔ کیا اس دوران اس سے آپ کا کسی بات پر کوئی اختلاف ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جی! کبھی کسی معاملے پر کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ میں تو اس کا بہت احترام کرتا ہوں۔ اس نے میرے ساتھ کبھی سخت لہجے میں بات بھی نہیں کی۔" شبیر احمد نے کہا۔

"آپ کو کچھ پینے پلانے سے بھی دلچسپی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کبھی کبھار دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر چسکی لگا لیتا ہوں جی! لیکن میاں جی کو اس کا علم نہیں تھا۔ وہ اس معاملے میں بڑے سخت تھے۔ ہر قسم کے نشے کے خلاف تھے۔ گاؤں والے بھی ان سے ڈرتے تھے۔ حقے، سگریٹ کے سوا گاؤں کے کسی شخص نے کبھی

کوئی اور نشہ نہیں کیا۔"

"دوستوں کے ساتھ پینے پلانے کی محفلیں پنڈ جھگیاں والے مکان میں جمتی تھیں اور تاجے تیلی کی بیوی زینو بھی ان محفلوں میں شریک ہوتی تھی؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

شبیر احمد کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اس نے میری معلومات کو چیلنج کرنے کی کوشش نہیں کی۔

"آپ جانتے ہیں جی' جوانی میں ایسی حرکت ہو ہی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے ان باتوں کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"گامے موچی سے آپ کے تعلقات کس قسم کے ہیں؟" میں نے ایک اور سوال کیا۔

"وہ ہیر وارث بہت اچھی گاتا ہے جی! اس کی آواز میں بڑا سوز ہے۔ اس سے ہیر سننے کے لیے کبھی کبھی اپنی بیٹھک میں بلا لیتا تھا۔" شبیر احمد نے کہا۔

"جس رات چوہدری صاحب کا قتل ہوا اس رات آپ پنڈ جھگیاں میں تھے لیکن صبح سویرے گاما موچی بھی آپ کے پاس پہنچ گیا تھا۔ کوئی خاص وجہ؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ ایک شام پہلے میں نے اسے پیغام بھجوا دیا تھا کہ وہ صبح سویرے میرے پاس پہنچ جائے۔ میں اسے اپنے ساتھ شہر لے جانا چاہتا تھا۔"

"آپ کو کسی پر شبہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جی! میاں جی کی کسی سے دشمنی نہیں تھی۔" شبیر احمد نے جواب دیا "میرے خیال میں تو یہ سیدھا سیدھا ڈکیتی کا کیس ہے جی! کوئی شخص چوری یا ڈاکے کی نیت سے میاں جی کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ میاں جی کی آنکھ کھل گئی اور چور نے انہیں قتل کر دیا۔"

"ہاں۔ اب تو انہی خطوط پر سوچنا پڑے گا۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی ہماری یہ ملاقات ختم ہو گئی۔

* * *

چھ مہینے گزر گئے۔ چوہدری مرید احمد کے قاتل کا سراغ نہیں مل سکا۔ ایس ایچ او انسپکٹر مشتاق نے اگرچہ اس کیس کی فائل بند کر دی تھی لیکن میرے ذہن میں ایک خلش تھی۔ میں نے ایک ایک شخص کے بارے میں تفتیش کی تھی۔ شبیر احمد کے سلسلے میں تو خاص طور پر بڑی گہرائی میں گیا تھا لیکن کسی کے بارے میں کوئی ایسی بات معلوم نہیں ہو سکی تھی کہ اس پر چوہدری کے قتل کا الزام عائد کیا جا سکتا۔ وہ اپنے عہد کے مطابق چہلم کے بعد سب کچھ رابعہ کے حوالے کر کے کہیں چلا گیا تھا۔

جس روز شبیر احمد سے میری ملاقات ہوئی تھی اس کے دوسرے روز میں نے دو کانسٹیبلوں کو سید پور بھیجا تھا کہ گامے موچی کو لے آئیں۔ میں اس سے کچھ اور پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا مگر پتا چلا کہ گاما موچی کسی کو بتائے بغیر کہیں چلا گیا ہے اور چھ مہینے گزرنے کے بعد بھی اس کا کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ اس کی جدائی میں اس کے ماں باپ بیمار ہو گئے تھے۔

اور پھر ایک روز مجھے چونکا دینے والی اطلاع ملی کہ شبیر احمد اور چوہدری مرید احمد کی جوان اور حسین بیوہ رابعہ نے آپس میں شادی کر لی تھی۔ مجھے یہ بھی پتا چل گیا کہ شادی کی یہ تقریب بڑی سادگی سے لاہور کے علاقے میراں دی کھوئی میں شبیر احمد کے ایک دوست کے گھر میں ہوئی تھی جس میں منشی سلامت علی اور گاؤں کے صرف دو آدمی شریک تھے۔

گاؤں والوں کو اس شادی کا پتا چلا تو بڑی لے دے ہوئی تھی۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ان دونوں میں ماں بیٹے کا رشتہ تھا اور یہ شادی جائز نہیں تھی جب کہ بعض لوگوں کا مؤقف تھا کہ شبیر احمد' چوہدری کی پہلی بیوی بشریٰ کے پہلے شوہر سے تھا۔ اس طرح چوہدری اور شبیر احمد میں خون کا کوئی رشتہ نہیں تھا اور رابعہ چوہدری کی دوسری بیوی تھی۔ رابعہ اور شبیر احمد میں بھی کوئی ایسا رشتہ نہیں بنتا تھا جو اس شادی میں رکاوٹ بن سکتا اس لیے ان دونوں کی یہ شادی جائز تھی۔

رابعہ اور شبیر احمد کی یہ شادی جائز تھی یا ناجائز؟ اس کا فیصلہ کرنا تو علما کا کام تھا لیکن دونوں کی شادی کی اطلاع پر میرے ذہن میں جو خلش تھی وہ ابھر کر سامنے آ گئی۔

مجھے حیرت تھی کہ پہلے میں نے اس معاملے پر زیادہ توجہ کیوں نہیں دی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میں شبیر احمد کی شرافت سے دھوکا کھا گیا تھا۔

شبیر احمد کا چوہدری مرید احمد سے کوئی خونی رشتہ نہیں بنتا تھا۔ اس طرح وہ چوہدری کی جائداد یا اس کے کسی حصے پر دعویٰ نہیں کر سکتا تھا لیکن اب چوہدری کی بیوہ سے شادی کر کے اس کے توسط سے وہ ساری جائداد اس کے قبضے میں آ گئی تھی۔

میں نے ایک بار پھر خفیہ طور پر شبیر احمد اور رابعہ بیگم کے خلاف تحقیقات شروع کر دیں۔ مجھے یقین تھا کہ گاما موچی اس گتھی کو سلجھانے کے لیے بڑا اہم کردار ادا کر سکتا تھا لیکن وہ غائب ہو چکا تھا۔

اس روز میں پنڈ جھگیاں کے قریب سے گزر رہا تھا کہ ایک عورت کھیتوں سے نکل کر میرے سامنے پگڈنڈی پر آ گئی۔ اس عورت نے سر پر پٹھوں کا گٹھڑ لاد رکھا تھا۔ میں نے گھوڑی روک لی اور اس عورت کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ تیس بتیس سال کی دراز قامت اور سڈول جسم کی مالک تھی۔ اس نے ڈوریے والا کرتہ اور لاچہ پہن رکھا تھا۔ دوپٹے کو اس نے گول کر کے سر پر رکھا ہوا تھا اور اس پر پٹھوں کا گٹھڑ تھا۔ دوپٹا نہ ہونے کی وجہ سے اس کا بدن بہت زیادہ نمایاں ہو رہا تھا۔ کرتے کے گلے کے دو بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اس کی رنگت گوری

اور چہرے کے نقوش بڑے پُرکشش تھے۔ آنکھوں میں بڑی چمک تھی۔ اس نے پٹھوں کا گٹھڑ نیچے پھینک دیا اور ایک ہاتھ سے... پھڑپھڑاتے ہوئے لاچے کا پلو درست کرتے ہوئے بولی۔

"کی گل اے تھانے دار جی! اس طرح میرے ول کیوں دیکھ رہے ہو؟" اس نے کرتے کے بٹن بند کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو تم زینو ہو۔ ناجے تیلی کی بیوی۔" میں نے اس کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"آہو جی! میں زینو ہوں۔ پر تیلی ہونا کوئی گناہ اے۔" اس کے لہجے میں بے باکی تھی۔

"کوئی گناہ نہیں ہے لیکن شریف لوگوں کو راستے سے بھٹکانا گناہ ضرور ہے۔"

"میں ساریاں کی شرافت جانتی ہوں جی!" وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھتے ہوئے بولی "مجھے پتا ہے کون کتنے پانی میں ہے۔"

میں نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اگر گاؤں کے مرد اس کی طرف مائل تھے تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔ زینو ایسی ہی تھی کہ دیکھنے والے کا دل بے ایمان ہو جائے۔

"اچھا! ایک بات تو بتاؤ زینو۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہیں یاد ہے جب سیّد پور کے چوہدری مراد احمد کا قتل ہوا تھا تو شبیر احمد اس رات یہاں تھا؟"

"آہو جی! مجھے چنگی طرح یاد ہے۔" زینو نے کہا "اس رات اس کے شہر والے یار بھی آئے ہوئے تھے اور نکے چوہدری نے مجھے بھی بلالیا تھا۔"

"اس روز صبح سویرے گاما موچی بھی یہاں آیا تھا۔ تمہیں یاد ہے وہ کس وقت آیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"صبح سویرے نہیں جی! گاما موچی تو آدھی رات کو آیا تھا۔ چھوٹا چوہدری اس وقت میرے ساتھ وکھرے کمرے میں تھا۔ اس کے یار دوسرے کمرے میں تھے۔ گامے نے اسے باہر بلا کے کچھ آکھیا تھا۔ وہ گامے کو میرے کول چھڈ کے چلا گیا۔ میں ساری رات گامے کے نال رہی تھی۔ صبح سویرے چھوٹے چوہدری نے بوہا کھولا اور کہنے لگا کہ وہ رات دوجے کمرے میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا رہا تھا۔"

"تم نے گامے اور چھوٹے چوہدری کی باتیں سنی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"ساری گل تو نہیں سنی تھی جی! پر پھاتاں کا نام میں نے ضرور سنا تھا۔" زینو نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ کسی کو بتانا مت کہ میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا اور سنو۔" میں نے ایک بار پھر اسے سر سے پیر تک گھورتے ہوئے کہا "پنڈ میں شرافت سے رہا کرو۔"

"کوئی شرافت نال رہنے دے تو رہوں تھانے دار جی!" زینو نے ڈھٹائی سے جواب دیا اور جھک کر پٹھوں کا گٹھڑ اٹھانے لگی۔

میں نے بھی گھوڑی کو آگے بڑھا دیا۔ زینو کی باتیں سننے کے بعد میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اصل صورتِ حال اب واضح ہوتی جا رہی تھی لیکن ابھی مجھے بہت کچھ کرنا تھا۔

میں صبر آزما انتظار کے بعد کامیابی کے قریب پہنچ رہا تھا اور اب مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا' بہت رازداری سے کرنا تھا۔ ذرا سی بے احتیاطی بنا بنایا کھیل بگاڑ سکتی تھی۔ میں نے سیّد پور کے ایک آدمی کو اعتماد میں لیا اور اسے اچھی طرح سمجھا دیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ تقریباً ایک ہفتے بعد مجھے مخبر نے اطلاع دی کہ پھاتاں گاؤں کی چند عورتوں کے ساتھ شہر گئی ہے۔

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس طرف باغ پورہ ہی وہ علاقہ تھا جہاں قرب و جوار کے دیہاتوں کے لوگ سودا سلف خریدنے کے لیے آتے تھے۔ میں یہ اطلاع ملتے ہی سادہ لباس میں باغ پورہ پہنچ گیا۔ باغ پورہ میں ایک بازار تو شیطان کی آنت کی طرح لمبا تھا۔ شالا مار باغ کے قریب سے شروع ہو کر حق نواز روڈ تک چلا گیا تھا۔ اس کے علاوہ دائیں بائیں گلیوں میں کئی بازار تھے لیکن میں جانتا تھا کہ دیہی علاقوں سے آنے والے لوگ اس بازار کے کس حصے میں مل سکتے ہیں۔ اس طرح پھاتاں کو تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ اس کے ساتھ گاؤں کی چار پانچ عورتیں تھیں۔ میں بڑی مہارت سے پھاتاں کو پکڑ کر بازار سے باہر لے آیا اور اسے تانگے پر بٹھا کر تھانے لے آیا۔

پھاتاں بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔

"مجھے یہاں کیوں لائے ہو تھانے دار جی!" اس نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

"صرف یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اس رات کیا ہوا تھا؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "سچ سچ بتا دو ورنہ تمہیں چوہدری کے قتل کے جرم میں پھانسی کے تختے پر پہنچا دوں گا۔"

پھاتاں فوراً ہی غبارے کی طرح پھٹ پڑی۔ وہ بولتی رہی اور میں سنتا رہا۔ بعض باتیں میں ڈائری میں بھی نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ بالآخر میں اٹھ کر ایس ایچ او کے کمرے میں آ گیا اور انسپکٹر مشتاق کو اس تازہ صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

"گڈ!" وہ مسکراتے ہوئے بولا "تم جو کرنا چاہو' میری طرف سے اجازت ہے۔"

پھاتاں کو گاؤں واپس بھیجنا مناسب نہیں تھا۔ اسے حوالات میں بند کروا دیا گیا اور اسی روز شام سے کچھ پہلے میں پولیس پارٹی لے کر سیّد پور پہنچ گیا۔ حویلی میں کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ شبیر احمد مجھے پولیس پارٹی کے ساتھ دیکھ کر کچھ پریشان سا ہو گیا۔

"خیر تو ہے ملک جی!" اس نے الجھی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"میں نے چوہدری مراد احمد کے قاتل کا سراغ لگا لیا ہے۔"

میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"اوہ۔۔۔ کہاں ہے وہ۔ کون ہے؟" اس کے لہجے میں بے چینی تھی۔

"میرے سامنے کھڑا ہے۔" میں نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ "شبیر احمد! تم شرافت سے میرے ساتھ چلنا پسند کرو گے یا ہتھکڑی لگانی پڑے گی۔"

شبیر احمد ایک دم ہتھے سے اکھڑ گیا۔ وہ بہت چیخا چلّایا لیکن میرے آدمیوں نے اسے قابو میں کرلیا۔ کچھ دیر بعد ہم شبیر احمد اور رابعہ کو لے کر تھانے روانہ ہوگئے۔

○☆○

یہ کہانی بڑی دلچسپ تھی۔ شبیر احمد جانتا تھا کہ چوہدری مرید احمد کی جائداد سے اسے کچھ نہیں مل سکتا تھا۔ وہ شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوشش کررہا تھا کہ چوہدری اپنی وصیت میں اسے جائداد کا وارث مقرر کردے مگر چوہدری اس پر آمادہ نہیں تھا۔ ان دونوں میں یہ سرد جنگ چل رہی تھی اور کسی کو اس کی ہوا تک نہیں لگ سکی تھی۔ اس دوران چوہدری مرید احمد نے رابعہ بی بی سے شادی کرلی۔

رابعہ بے حد حسین اور جوان تھی لیکن چوہدری مرید احمد عمر رسیدہ تھا۔ اس بے جوڑ شادی پر رابعہ صبر کرکے بیٹھ گئی۔ اس دوران شبیر احمد کے دماغ میں ایک منصوبہ کلبلانے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ ویسے تو اسے چوہدری کی جائداد سے کچھ نہیں مل سکتا تھا۔ البتہ وہ رابعہ کے توسط سے اس جائداد پر قابض ہوسکتا تھا۔ وہ جوان اور خوب رو تھا۔ رابعہ بھی جوان تھی۔ اس نے رابعہ پر ڈورے ڈالنے شروع کردیے۔ رابعہ پہلے تو کتراتی رہی پھر اس کے جال میں پھنس گئی۔ اسے پوری طرح اپنے جال میں پھنسا لینے کے بعد شبیر احمد نے اس کے سامنے اپنا منصوبہ پیش کیا تو وہ کانپ اٹھی۔ شبیر احمد نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اس منصوبے پر اس طرح عمل کرے گا کہ کسی کو ان پر شبہ نہیں ہوگا۔

اسی دوران چوہدری مرید احمد کو بھی ان کے تعلقات کا پتا چل گیا۔ اس نے شبیر احمد سے کہا کہ وہ اپنا مستقبل سنوارنے کے لیے جتنی رقم چاہتا ہے اس سے لے لے اور یہاں سے چلا جائے۔ شبیر احمد نے اسے یقین دلایا کہ وہ چند روز میں وہاں سے چلا جائے گا۔

شبیر احمد نے بھاتاں کو بھی اس منصوبے میں شامل کرلیا۔ وہ لالچی عورت تھی، آسانی سے اس کے قابو میں آگئی۔ پروگرام کے مطابق شبیر احمد تین دن پہلے پنڈ جھگیاں چلا گیا اور پھر اس روز رابعہ بھی اپنے میکے نوناریاں پنڈ چلی گئی۔

چوہدری مرید احمد کو نزلے کی شکایت ہورہی تھی۔ وہ شام کو حکیم سے جوشاندہ لے آیا تھا۔ بھاتاں نے جوشاندے میں شبیر احمد کی دی ہوئی بے ہوشی کی دوا ملادی اور آدھی رات کو جب اسے یقین ہوگیا کہ چوہدری بے ہوشی کی نیند سورہا ہے تو اس نے گامے موچی کے گھر جا کر اسے پیغام دے دیا۔ گاما موچی بھاگم بھاگ جھگیاں پہنچ گیا۔ اس نے شبیر احمد کو صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔ شبیر احمد اسے زینو کے پاس چھوڑ کر گھوڑے پر سوار سیدپور پہنچ گیا۔ اس نے گھوڑا باہر ایک درخت سے باندھ دیا اور گاؤں میں آکر حویلی میں کود گیا۔ کتا ڈبو اس وقت حویلی کے صحن میں گشت پر تھا۔ وہ کسی کو دیوار سے کودتے دیکھ کر غراتا ہوا اس کی طرف لپکا لیکن پھر مالک کی بو پا کر اس کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا۔ شبیر احمد نے اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ ایک طاقت ور آدمی تھا۔ اس نے کتے کا گلا گھونٹ کر اس کی لاش لکڑیوں کے انبار کے پیچھے پھینک دی۔

بھاتاں رات کو جب چوہدری کو جوشاندہ دینے آئی تھی تو اس نے بڑی خوب صورتی سے ایک کھڑکی کی کنڈی کھول دی تھی۔ اس کے جانے کے بعد چوہدری نے دروازہ اندر سے بند کرلیا تھا۔ شبیر احمد اس کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوا۔ اس نے تیز دھار آلے سے پے در پے وار کرکے چوہدری کو قتل کردیا اور تجوری کھول کر اس میں سے سب کچھ نکال لیا اور اسی راستے سے فرار ہوگیا۔ وہ رات کے آخری پہر جھگیاں پہنچا تھا جہاں کچھ وقت اس نے پھر زینو کے ساتھ گزارا اور صبح سویرے اپنے دوستوں کے ساتھ شہر چلا گیا۔ گامے موچی کو اس نے داروغہ والا سے واپس بھیج دیا تھا تاکہ وہ گاؤں کے حالات پر نظر رکھ سکے۔

کیس عدالت میں پیش ہوا۔ شبیر احمد صحتِ جرم سے مسلسل انکار کرتا رہا لیکن بہت سی شہادتیں اس کے خلاف تھیں۔ رابعہ بی بی سلطانی گواہ بن گئی تھی۔ اس نے شبیر احمد کا سارا منصوبہ عدالت کے سامنے بیان کردیا۔ بھاتاں نے بھی اس کے خلاف بیان دیا تھا۔ پنڈ جھگیاں والے مکان سے وہ تمام رقم اور زیورات بھی مل گئے جو چوہدری مرید احمد کی تجوری سے نکالے گئے تھے۔ اس مکان سے شبیر احمد کا وہ لباس بھی مل گیا جو اس نے قتل کی رات پہنا ہوا تھا۔ اس پر نہ صرف خون کے دھبے تھے بلکہ اس کتے کے بال بھی چپکے ہوئے تھے جسے اس نے حویلی میں گلا گھونٹ کر ہلاک کیا تھا۔

شبیر احمد کے خلاف میرا کیس ہر لحاظ سے مکمل تھا۔ اس کا وکیل کچھ بھی نہیں کرسکا اور عدالت نے شبیر احمد کو عمر قید کی سزا سنادی۔

تو قارئین! یہ تھی وہ کہانی جو ٹھٹھہ کی شاہ جہانی مسجد میں اس بوڑھے کو دیکھ کر یاد آئی تھی۔ بوڑھے گامے موچی نے باتوں کے دوران بتایا کہ اگرچہ اس قتل میں وہ براہِ راست ملوث نہیں تھا لیکن پکڑے جانے کے خوف سے گاؤں سے بھاگ گیا تھا اور نجانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے بالآخر ٹھٹھہ پہنچ گیا تھا اور اس مسجد کا خدمت گار بن کر اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا تھا۔